ISSN 2221-1659

سہ ماہی سماجی و دینی تحقیقی مجلّہ

# نورِ معرفت

جلد:10 شمارہ:1 مسلسل شمارہ:43 جنوری تا مارچ 2019ء

امت واحدہ کا قرآنی تصور

مطالعہ قرآن کے اساسی اصول

تفسیر نمونہ میں ناصر مکارم کا فقہی طرز استدلال

اسلامی ثقافت کا قدیم شہر منصورہ: تاریخی وسیاسی جغرافیا

اکبر شاہ کے دین الٰہی کی تشکیل کے بنیادی اہداف اور اثرات

تفسیر نجوم الفرقان اور تدبر قرآن کی اختلافی مباحث کا تقابلی جائزہ

EARLY CHILDHOOD DEVELOPMENT

www.nmt.org.pk

نور الہدیٰ مرکز تحقیقات (اسلام آباد)

# مقالہ نگاروں کے لئے چند ضروری ہدایات

سہ ماہی سماجی/دینی تحقیقی مجلّہ "نور معرفت" کا ہدف عامۃ الناس کے اذہان کو علم کی ضیاء پاشیوں سے منّور کرنے کے ساتھ ساتھ ملک کے اعلی تعلیم یافتہ طبقہ کی علمی پیاس بجھانا ہے۔ اس جریدے میں علوم قرآن و حدیث، فقہ و اصول فقہ، کلام و فلسفہ؛ اسلامی تاریخ، تقابل ادیان، تعلیم و تدریس، ادبیات، معاشیات، عمرانیات، سیاسیات، اقبالیات، ثقافت و تمدن، قانون و اصول قانون وغیرہ پر اسلامی نقطہ نظر سے مقالات کے علاوہ علمی کتابوں پر تبصرے شائع کئے جاتے ہیں۔ اس مجلے کا ایک اہم ہدف، علمی مراکز کے اساتذہ اور طلاب کے درمیان تحقیقی ذوق پیدا کرنا اور محقق پروری ہے۔ لہٰذا یہ جریدہ علماء اور دانشور حضرات کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ اس علمی، تحقیقی کام میں ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں اور اپنے قیمتی مقالات سے اس مجلّہ کے صفحات کو مزیّن فرمائیں۔ مقالہ نگاروں سے گزارش ہے کہ وہ اپنے مقالات کی تدوین میں درج ذیل ہدایات کی مکمل پابندی کریں:

1. مقالات غیر مطبوعہ اور ترجیحی بنیادوں پر کمپوز شدہ (سافٹ) ہوں۔ مقالہ کی ضخامت بیس - پچیس صفحات سے زائد نہ ہو۔ اصلی مآخذ اختیار کریں اور مضمون کے آخر میں کتابیات Turabian Style اس ترتیب کے مطابق مرتب کریں: مصنف کا لقب، مصنّف کا نام؛ کتاب کا نام، پبلشر کا نام؛ ملک/شہر؛ سن طباعت۔ مثال کے طور پر: الزبیدی، سید مرتضی، تاج العروس، تحقیق: علی شیری؛ دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت۔ 1994ء لیکن Endnotes میں فقط مصنف کا نام، کتاب کا سال طباعت، جلد اور صفحہ تحریر کریں۔ مثال کے طور پر: الزبیدی/ 1994ء؛ ص 23
2. مقالات میں کسی قسم کی Plagiarism یا علمی سرقت نہ ہو اور مقالات ترجیحی بنیادوں پر ایسے موضوعات پر ہوں جو ادارہ تجویز کرے۔ نیز مقالے کے کلیدی کلمات اور زیادہ سے زیادہ 150 الفاظ پر مشتمل اردو، انگریزی خلاصہ (Abstract) بھی بھیجا جائے۔
3. نور معرفت میں شائع شدہ مقالات کسی اور جگہ طبع کرانے کی صورت میں مجلّہ ہٰذا کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
4. مدیر مجلّہ کا مقالہ نگار کی تمام آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے؛ لہٰذا مجلّہ اپنی پالیسیوں کے پیش نظر مقالات کی تہذیب کا حق رکھتا ہے۔
5. مقالات Peer Review کے بعد ماہرین کی منظوری سے شائع کیے جائیں گے۔
6. مقالے کا ایچ ای سی کی مجوزہ روشِ تحقیق اے. پی. اے (APA) پر مشتمل ہونا ضروری ہے۔

**رجسٹریشن فیس:** پاکستان، انڈیا: 500 روپے　مڈل ایسٹ: 70 ڈالرز　یورپ، امریکہ، کنیڈا: 150 ڈالرز


**ناشر: سید حسنین عباس گردیزی**　**پریس: پکٹوریل پریس آبپارہ اسلام آباد**

**Declaration No: 7334**

ISSN 2221-1659

سہ ماہی سماجی، دینی تحقیقی مجلّہ

# نورِ معرفت

# NOOR-E-MARFAT

جلد:10 | شمارہ:1 | مسلسل شمارہ:43

جنوری تا مارچ 2019ء

بمطابق جمادی الاول تا رجب المرجب 1440ھ

Indexed by Islamic Research Index (IRI) AIOU

**مدیر:**

**ڈاکٹر محمد حسنین**

**نور الہدیٰ مرکز تحقیقات، اسلام آباد**

E-mail: noor.marfat@gmail.com

## EDITORIAL BOARD — مجلس ادارت

**S. Imtiaz Ali Rizvi** — **سید امتیاز علی رضوی**

Patron in Chief — سرپرست اعلیٰ

**S. Ali Murtaza Zaidi** — **سید علی مرتضیٰ زیدی**

Patron — سرپرست

**S. Hasnain Abbas Gardezi** — **سید حسنین عباس گردیزی**

Editor in Chief — مدیر اعلیٰ

**Dr Sh. Muhammad Hasnain** — **ڈاکٹر شیخ محمد حسنین**

Editor — مدیر

**S. Rameez ul hasan Mosvi** — **سید رمیز الحسن موسوی**

Associate Editor — معاون مدیر

**Dr. Ali Raza Tahir** — **ڈاکٹر علی رضا طاہر**

Punjab Univeristy, Lahore. — پنجاب یونیورسٹی، لاہور

**Dr. Roshan Ali** — **ڈاکٹر روشن علی**

IMCB, Islamabad — اسلام آباد ماڈل کالج فار بوائز، اسلام آباد

**Dr. Abou Turab** — **ڈاکٹر ابو تراب**

QIU, Islamabad. — قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد

**Dr. Sajid Ali Subahani** — **ڈاکٹر ساجد علی سبحانی**

MIU, Islamabad. — المصطفیٰ انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد

| | |
|---|---|
| Office Assistant: Tahir Abbas | معاون دفتری امور: طاہر عباس |
| Composer/ Designiner: Babar Abbas | کمپوزنگ/ڈیزائننگ: بابر عباس |

| NATIONAL ADVISORY BOARD | قومی مجلس مشاورت |
| --- | --- |
| **Dr. Syed Nisaar Ali Hamdani** | **ڈاکٹر سید نثار علی ہمدانی** |
| AJKU, AJK. | اے۔ جے۔ کے یونیورسٹی، آزاد کشمیر |
| **Dr. Hafiz Muhammad Sajjad** | **ڈاکٹر حافظ محمد سجاد** |
| AIOU, Islamabad. | علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد |
| **Dr. Karam Hussain Wadhoo** | **ڈاکٹر کرم حسین ودھو** |
| Larkana Regional Directorate of Colleges | ریجنل ڈائریکٹوریٹ آف کالجز (لاڑکانہ) |
| **Dr. Qandeel Abbas Kazmi** | **ڈاکٹر قندیل عباس کاظمی** |
| QIU, Islamabad. | قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد |
| **Dr. Muhammad Riaz** | **ڈاکٹر محمد ریاض** |
| University of Baltistan, Skardu. | بلتستان یونیورسٹی، اسکردو |

| INTERNATIONAL ADVISORY BOARD | بین الاقومی مجلس مشاورت |
| --- | --- |
| **Dr. Syed Rashed Abbas Naqvi** | **ڈاکٹر سید راشد عباس نقوی** |
| Ahlulbayait Univ. Tehran, Iran. | اہل بیت یونیورسٹی تہران، ایران |
| **Dr. Yaqoob Bashvi** | **ڈاکٹر یعقوب بشوی** |
| MIU, Qum, Iran. | جامعۃ المصطفیٰ العالمیہ قم، ایران |
| **Dr. Syed Talmeez Hasnain Rizvi** | **ڈاکٹر سید تلمیذ حسنین رضوی** |
| New Jerci, America. | نیو جرسی، امریکا |
| **Dr. Ghulam Hussain Meer** | **ڈاکٹر غلام حسین میر** |
| MIU, Qum, Iran | جامعۃ المصطفیٰ العالمیہ قم، ایران |
| **Dr. Sukaina Hussain** | **ڈاکٹر سکینہ حسین** |
| Australia | آسٹریلیا |

# مقالہ نگاروں کا تعارف

**ڈاکٹر شیخ محمد حسنین** (محقق، مدیر سہ ماہی سماجی، دینی تحقیقی مجلّہ نور معرفت، استاذ فلسفہ اسلامی، پرنسپل دی ایمز سکول اینڈ کالج، بارہ کہو، اسلام آباد)

E-Mail: Sheikh.hasnain26060@gmail.com

**محمد مدثر شفیق** ((وزٹنگ لیکچرار، نمل یونیورسٹی (ملتان کیمپس)/پی ایچ ڈی سکالر، اسلامک سٹیڈیز اینڈ عربی ڈیپارٹمنٹ جی سی یونیورسٹی، لاہور)

E-Mail: mudassaraarbi@gmail.com

**ڈاکٹر محمد نعیم انور الازہری** (اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامک سٹیڈیز اینڈ عربی ڈیپارٹمنٹ جی سی یونیورسٹی، لاہور)

**حافظ عبدالغفار** (پی ایچ ڈی، سکالر، اسلامک اینڈ عرابیک ڈیپارٹمنٹ، جی سی لاہور)

E-Mail: abdulghafoor976@gmail.com

**ڈاکٹر حافظ خورشید احمد قادری** (اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامک عرابیک ڈیپارٹمنٹ، جی سی لاہور)

**ذوالفقار علی** (پی۔ایچ۔ڈی۔اسٹوڈنٹ تاریخ اسلام، تہران یونی ورسٹی)

E-Mail: zulfimari72@gmail_com

**اصغر عسکری** (ممبر قومی کمیشن برائے بین المذاہب ہم آہنگی وزارت مذہبی امور پاکستان)

E-Mail: maaskari110@gmail_com

**فیضان جعفر علی** (پورہ معروف کرتھی جعفر پور ضلع مئو، یوپی ہندوستان)

E-Mail: aizanjafar110@gmail.com

**محب رضا** (ایم فل، یونی ورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی، یو ایم ٹی، لاہور)

*M.Phill (School Leadership & Management) University of Management & Technology, UMT, Lahore.*

# فہرست


| نمبر شمار | موضوع | مقالہ نگار | صفحہ |
|---|---|---|---|
| ۱ | اداریہ | مدیر | 6 |
| ۲ | مطالعۂ قرآن کے اساسی اصول | ڈاکٹر شیخ محمد حسنین | 8 |
| ۳ | تفسیر نمونہ میں ناصر مکارم کا فقہی طرز استدلال | محمد مدثر شفیق | 34 |
| ۴ | تفسیر نجوم الفرقان اور تدبر قرآن کی اختلافی مباحث کا تقابلی جائزہ | حافظ عبدالغفار | 54 |
| ۵ | اکبر شاہ کے دین الٰہی کی تشکیل کے بنیادی اہداف اور اثرات | ذوالفقار علی | 77 |
| ۶ | امت واحدہ کا قرآنی تصور | اصغر عسکری | 94 |
| ۷ | اسلامی ثقافت کا قدیم شہر "منصورہ": تاریخی وسیاسی جغرافیا | فیضان جعفر علی | 108 |
| ۸ | Early Childhood Development | Mohib Raza | 130 |

## اداریہ

قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے جس کے مطالب کبھی کہنہ نہیں ہوتے۔ قرآن "تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا" کی قرآنی مثال کا اتم مصداق اور وہ شجرۂ مبارکہ ہے جو ہر خطے اور ہر موسم کے مطابق پھل دیتا ہے۔ قرآن کا اعجاز یہی ہے کہ یہ بدلتا نہیں، بنی نوع بشر کے بدلتے حالات کے مطابق ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ ہاں! ہر دور کے انسان کے لئے قرآن سے نورِ ہدایت پانے کی اساسی شرط یہ ہے کہ قرآن کا قاری، قرآن کا روش مندانہ مطالعہ کرے۔ اِس لئے کہ قرآن کے مطالعہ کے چند اساسی اصول ہیں اور جب تک ان اصولوں کی پیروی نہ کی جائے قرآن کریم سے درست استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ مطالعۂ قرآن کے ان اساسی اصولوں پر ایک سلسلہ وار مضمون مجلّہ نور معرفت کے پیشِ نظر شمارہ کے صفحات کی زینت بن رہا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ یہ تحریر قرآن کریم کے قارئین کے لئے موثر و مفید ثابت ہو گی۔

قرآن سیاسیات، عمرانیات، اقتصادیات، معاملات اور عبادات، غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں رہنما اساسی اصول بیان کرتا ہے۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات قرآن سے ایک مفسر کے طرزِ استدلال و استنباط کے بدلنے سے یہ اصول بدل جاتے ہیں۔ اگرچہ ہر مفسر اپنی تحقیق کے مطابق تفسیر قرآن کے طے شدہ اصولوں کے مطابق ایک خاص طرز استدلال و استنباط اپناتے ہوئے اپنی رائے قائم کر سکتا ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ طرز استدلال و استنباط نقد و نظر کی ترازو پر مسلسل تولا جاتا رہے تاکہ اس کے نقاطِ قوّت و ضعف کو برملا کیا جائے۔ ایسا کرنے سے قرآن کریم کی تفسیر میں مضبوط، منطقی اور متین طرزِ استدلال اپنانے میں مدد ملے گی۔ نورِ معرفت کے اِس شمارہ میں عصر حاضر کی معروف تفسیر، "تفسیر نمونہ" کے مفسر کے قرآن کریم سے فقہی استنباط کے طرزِ استدلال کو پرکھا گیا ہے۔ اگرچہ یہ مقالہ اس راہ میں پہلا قدم ہے، تاہم اس سے مختلف مفسرین کے قرآن کریم سے فقہی طرزِ استدلال کے تقابلی جائزہ میں مدد ملے گی۔

مجلّہ نور معرفت کے اس شمارے کا تیسرا مضمون بھی قرآنیات سے مربوط ہے۔ اس مضمون میں تفسیر میں دو مدّمقابل مشرب کے حامل مفسرین کی بعض تفسیری آراء کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ تفسیر "نجوم الفرقان" اور "تدّبر قرآن" کی اختلافی مباحث کے تقابلی جائزہ کے نتیجے میں قرآن کریم کا قاری تفسیر کے شعبے میں بہتر سے بہتر مفسّر اور دقیق سے دقیق تر تفسیر کا انتخاب کر سکتا ہے۔

سماجی علوم کے مطالعات کی دنیا میں تاریخِ ادیان کے افق پر بشری اور آسمانی ادیان کے نجوم کے طلوع اور افول کی داستان بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ یہ وہ پارینہ قصّہ ہے جسے گاہے گاہے دہرا لینے سے جہاں باطل ادیان کی سرگذشت سے عبرت کا سامان مہیا ہوتا ہے، وہاں دینِ حق کے انتخاب اور اس کی پیروی میں مدد ملتی ہے۔ مجلّہ نور معرفت کے تازہ شمارے میں "اکبر شاہ کے دین الٰہی کی تشکیل کے بنیادی اہداف اور اثرات" کے موضوع پر ایک جاندار تحریر شامل ہے۔ یہ تحریر جہاں دین میں تعصب سے کام لینے اور دین کے نام پر بنی نوعِ بشر سے دشمنی کے تباہ کن اثرات اور بدعات کی ایجاد کی طرف ہماری توجہ مبذول کرواتی ہے، وہاں دین میں لبرل ازم، پلورالزم اور ہیومنزم کے خطرات اور بدعات کی ایجاد سے بھی آگاہ کرتی ہے۔

سماجی اصلاح کے علمبرداروں کے لئے ایک پریشانی انسانی سماج کے اندر پایا جانے والا افتراق رہا ہے۔ مسلمان معاشرہ بھی اس مصیبت میں ہمیشہ مبتلا رہا ہے۔ اس کی اصل وجہ مسلمانوں کی قرآن کریم کی نورانی تعلیمات سے روگردانی ہے۔ قرآن کریم نے امّت واحدہ کا جو تصوّر دیا ہے، اِس امّت نے اس تصور کی پیروی کی بجائے اُس کی نفی میں 72 ملتیں تراش ڈالی ہیں۔ تاہم دین کا درد رکھنے والے رہنماؤں، دانشوروں اور علماء نے ہمیشہ امّت کی وحدت پر زور دیا ہے اور اِس وحدت و اتحاد کے تحقق کے لئے عملی کوششیں کی ہیں۔ قرآن کے امّت واحدہ کے تصوّر کو اجاگر کرنا، اتحادِ امّت کی فکری بنیادیں استوار کرنا اور مسلکی انا پرستی سے احتراز دراصل، ایسی تمام کوششوں کا سنگِ بنیاد ہیں۔ نور معرفت کے موجودہ شمارے میں "امّت واحدہ کا قرآنی تصوّر" کے عنوان سے ایک تحریر اِس توقع پر شامل کی جارہی ہے کہ شاید اس کے مطالعہ کے بعد ہم اس اہم سمت میں ایک قدم مزید آگے بڑھ جائیں۔

عالمی تاریخی، سیاسی اور جغرافیائی منظر نامے پر مسلمان امّت کے عروج و زوال کی داستان بھی اپنے اندر کئی عبرتیں لیے ہوئے ہے۔ جب بھی اِس امّت نے صداقت، شجاعت، امانت اور عدل و انصاف کے معیار قائم کیے تو اُن معیارات پر نہ فقط نئے سماج تشکیل پائے، بلکہ بستیاں اور شہر بسائے گئے۔ لیکن جب زیست کے یہ پیمانے بدلے تو مسلمانوں کی تہذیبی برتری کے بڑے بڑے میخانے بھی تباہ ہو گئے۔ اسلامی ثقافت کے حامل قدیم شہر "منصورہ" کی داستاں بھی اسی قمار خانے کی داستان ہے۔ مجلّہ نور معرفت کے موجودہ شمارے میں اس شہر کی تاریخی حیثیت اجاگر کی گئی ہے تاکہ عبرت لینے والوں کے لئے ایک سبق کا مزید اہتمام ہو جائے۔ ہمیں بھرپور توقع ہے کہ انشاء اللہ نور معرفت کا یہ شمارہ بھی ہمارے قارئین کے لئے انتہائی مفید ثابت ہوگا۔

* * * * *

# مطالعۂ قرآن کے اساسی اصول

## *THE BASIC PRINCIPLES OF THE STUDY OF THE QURAN*

***Dr. Sheik. Muhammad Hasnain***


## *Abstract:*

*This article is continuation of the debate about the principles of the study of the Quran. It deals with its 5th principle according to that the understanding of the person who is engaged in studying the Quran must be coherent with the rules of reason & rationality. For the author, an accurate understanding of the Quran is possible only when its recitor does not abandon the reason and logical argumentationts as this is granted authenticity (hujjiyat) by Almighty Allah against humans and its validity is established by Quranic verses and traditions of the infallible imams. It is, however, not to say that Quran is subordinate to reason; since recitors' understanding of Quran is a human reality; not Quran itself. In simple words, to follow the rules and principles of reason in understanding the Quran is not to juxtapose it with reason. Author also explains the nature of reason, its different types and their rules & Regulations and those prerequisites necessary to follow for understanding the Quran.*


***Key words:*** *Understanding the Quran, basic principles, authenticity, theoretical reason, practical reason.*

**کلیدی کلمات**: مطالعۂ قرآن، قرآن فہمی، اساسی اصول، حجیّت، عقل نظری، عقل عملی۔

### تعارف

زیر نظر مقالہ مجلّہ نورِ معرفت میں مطالعۂ قرآن کے اساسی اصول کے عنوان کے تحت چھپنے والی بحث کا تسلسل ہے۔ اس مقالہ میں مطالعۂ قرآن کا پانچواں اساسی اصول بیان کیا گیا ہے۔ اس اصول کے مطابق، قرآن کریم کے قاری کا قرآنی تعلیمات و مطالب کا فہم، عقلی اصول و ضوابط سے متصادم نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ قرآن کا

قاری تنہا اُسی صورت میں قرآن کا درست فہم حاصل کر سکتا ہے جب وہ قرآن فہمی کے کسی مرحلہ پر بھی عقل و استدلال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ دراصل، مقالہ نگار کے مطابق خدا کے بندوں پر عقل، خدا کی حجّت ہے۔ عقل کی حجیّت کئی قرآنی آیات اور معصومین علیہم السلام کی روایات کی روشنی میں ثابت شدہ ہے۔

البتہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن عقل کے تابع ہے؛ کیونکہ قرآن ایک وحیانی حقیقت ہے جبکہ قرآن کے قاری کی قرآن فہمی ایک بشری حقیقت ہے۔ لہٰذا قرآن فہمی میں عقلی اصول و ضوابط کی پیروی کے لازم ہونے کا معاملہ، قرآن و عقل کا تقابل ہی شمار نہیں ہوتا۔ مقالہ کے آخری حصّے میں مقالہ نگار نے یہ واضح کیا ہے کہ وہ عقل جس کے اصول و ضوابط کی پیروی مطالعۂ قرآن کا اساسی اصول ہے اس سے کیا مراد ہے؟ مقالہ ہٰذا میں عقل کی مختلف اقسام اور اس کے اساسی اصول و ضوابط کی توضیح پیش کرتے ہوئے اُن عقلی احکام اور ان کے لوازمات کو اجاگر کیا گیا ہے جن کی پیروی مطالعۂ قرآن کا اساسی اصول ہے۔

## مطالعۂ قرآن کا پانچواں اساسی اصول

"مطالعۂ قرآن کے اساسی اصول" کے عنوان کے تحت چھپنے والے مقالات میں مطالعۂ قرآن کا چوتھا اساسی اصول یہ بیان ہوا کہ جس شخص کے پاس قلبِ سلیم نہ ہو اور وہ اہلِ تقویٰ نہ ہو، ایسا شخص چاہے کتنا بڑا دانش مند، فلسفی اور اہلِ دقّت و نظر ہی کیوں نہ ہو، قرآنی ہدایت وارشاد سے بے بہرہ رہتا ہے۔ تاہم یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ آیا قرآن فہمی کے لئے نفس کا تزکیہ کافی ہے؟ یا قرآن کے قاری کے لئے جہاں نفس و روح کی پاکیزگی اور طہارت ضروری ہے، وہاں اُس کے لئے عقل و منطق اور استدلال و برہان کے عصا کا سہارا لینا بھی ضروری ہے؟ مذکورہ بالا سوال کا جواب، مطالعۂ قرآن کا پانچواں اساسی اصول تشکیل دیتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن کا قاری تنہا اُسی صورت میں قرآن کا درست فہم حاصل کر سکتا ہے جب وہ قرآن کے مطالعہ کے دوران کسی مرحلہ پر بھی عقل واستدلال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ دوسرے الفاظ میں قرآن کا قاری، قرآن فہمی میں ہر آن عقل و منطق کے ضابطوں کی مکمل پابندی کا محتاج ہے اور ان ضابطوں سے ٹکراؤ کی صورت میں قرآنی آیات کا کوئی فہم معتبر نہیں ہے۔

یقیناً مطالعۂ قرآن کے سابقہ اصولوں کی مانند یہ اصول بھی بلاتامّل قبول نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ایک طرف بشری عقل کی حقائق تک رسائی کی صلاحیت پر کافی اعتراضات اٹھائے جا چکے ہیں اور دوسری طرف، مسلم امّت کے کئی علماٗ کے ہاں عقل پر عدمِ اعتماد کی فضا پائی جاتی ہے۔ ایسے میں ضروری ہے کہ ہم مطالعۂ قرآن کے اِس اساسی اصول کی صحت کے اثبات کے لئے دینی تعلیمات کے بنیادی منابع کا سہارا لیں۔

## قرآن اور عقل کی حجّیت

اگر ہم قرآن کریم کی آیات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خود قرآن کریم کا اصرار ہے کہ اُس کے مطالعہ کے دوران کسی مرحلہ پر بھی عقل واستدلال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ قرآن کریم نے ہمیشہ عقل کی پیروی پر زور دیا ہے۔ انسانی عقل کے بارے میں دو چیزیں قرآنی تعلیمات کا نچوڑ ہیں: ایک، عقل کی پیروی؛ دوسری، عقل پروری۔ ہم قرآن کریم کی عقل پروری پر بعد میں بحث کریں گے لیکن یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآن کریم ہمیشہ عقل کی پیروی کا حکم دیتا اور اِس پر تاکید کرتا ہے۔ قرآن اپنے قاری کو ہمیشہ عقلی ضابطوں کی پیروی کی دعوت دیتا ہے؛ چاہے عقل نے یہ ضابطے قرآن کی گود میں پرورش پا کر بنائے ہوں یا عقل کے یہ ضابطے قرآن کے نزول پر مقدّم اور وحی کے قبول کا مقدمہ ہوں۔ بہر صورت، قرآن کا منتہائے دعوت یہی ہے کہ کوئی انسان کسی عقلی ضابطے کو نہ توڑے کیونکہ عقل خدا کے بندوں پر خدا کی حجّت ہے۔ قرآن کریم کی وہ آیات جو عقل کو حجّت اور اس کی پیروی پر تاکید کرتی ہیں، درج ذیل اقسام میں تقسیم کی جاسکتی ہیں:

1. وہ آیات جن کے مطابق انسان کی انسانیّت، اس کی عقل مندی اور عقلی ضابطوں کی پابندی کی مرہونِ منّت ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا[1] یعنی: "آیا انسان پر ایک ایسا وقت نہیں گزر چکا ہے کہ جب وہ کوئی قابلِ ذکر چیز ہی نہ تھا۔ بے شک ہم نے انسان کو مخلوط نطفہ سے پیدا فرمایا جسے ہم ابتلاء و آزمائش میں ڈالتے ہیں، پس ہم نے اسے سننے والا، دیکھنے والا بنایا ہے۔"

دراصل، اِس کائنات کی ہر چیز کی ایک مخصوص فطرت، شخصیت اور شاکلہ ہے اور اُس کا عمل اس کے شاکلہ اور شخصیت کی ترجمانی کرتا ہے: قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا[2] یعنی: "کہہ دیجئے: ہر کوئی اپنے طریقہ پر عمل پیرا ہے، اور آپ کا رب خوب جانتا ہے کہ سب سے زیادہ سیدھی راہ پر کون ہے۔" اس آیت کے مطابق، اگر کسی چیز کا شاکلہ معلوم نہ ہو تو اس کا کام دیکھا جائے۔ جیسا اس کا کام ہوگا، ویسی اس کی فطرت، شناخت اور شاکلہ ہوگا۔ سورہ انسان کے مطابق انسان کی فطرت، شخصیت اور شاکلہ اُس کے "سمیع و بصیر" (سننے والا، دیکھنے والا) ہونے کے گروی ہے۔ یوں تو اللہ تعالیٰ نے کئی حیوانات کو کان اور آنکھیں دے رکھی ہیں، لیکن انسانی کانوں، آنکھوں اور حیوانی کانوں آنکھوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوانات فقط کان، آنکھ پر بھروسہ کرتے ہیں اور اُن کی معلومات محض حسی معلومات

ہیں۔ حیوانات عقلی معرفت سے بے بہرہ ہیں۔ عقلی معرفت تو کجا، حیوانات قوّتِ خیال سے بھی محروم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک ایک حیوان کے کان سنتے رہیں اور آنکھیں دیکھتی رہیں، انہیں سنی، دیکھی چیز کا علم حاصل رہتا ہے لیکن جونہی ان کے کان، آنکھ بند ہوتے ہیں، یا سنی، دیکھی جانے والی چیزیں ان کے حواس کی رسائی سے باہر نکل جاتی ہیں، حیوانات کا یہ علم بھی رختِ سفر باندھ لیتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ حیوانات کا علم فقط حسی اور جزئی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، انسان کانوں اور آنکھوں کے حواس سے کام لیتے ہوئے عقلی معرفت فراہم کرتا ہے۔ دراصل، عقلمندی، کلی معرفت کے حصول کا نام ہے اور عقلی ضابطے ہمیشہ کلی، کائناتی اور جاودانی ہوتے ہیں۔ جب تک انسان کے پاس یہ کلی علم و معرفت نہ ہو وہ صاحبِ اختیار و ارادہ نہیں ہو سکتا اور نہ اس کا امتحان لیا جا سکتا ہے اور نہ اُسے کسی ابتلاء وآزمائش میں ڈالا جا سکتا ہے۔ کیونکہ انسان کا کلی علم و معرفت، اُس کے ارادہ کی تشکیل کے مراحل میں سب سے بنیادی اور اہم مرحلہ ہیں۔ پس اگر سمیع و بصیر " نَّبْتَلِيْهِ " کی فرع ہے اور " فَجَعَلْنٰهُ " کی فائے تفریعیہ اِسی امر کی نشاندہی کرتی ہے تو انسانی سمع و بصر کا لازمہ عقلی معرفت کا حصول اور صاحبِ ارادہ واختیار ہونا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کی فطرت اور شاکلہ میں اس کا عقلی معرفت کا مالک ہونا خوابیدہ ہے اور عقلی معرفت کا دوسرا نام، عقلی ضابطے اور اصول ہیں۔ جس کے پاس عقلی ضابطے اور اصول نہ ہوں، اُس کا شاکلہ انسانی نہیں اور اسلامی تعلیمات کے مطابق ایسا شخص چاہے نمازِ تہجد بھی پڑھ رہا ہو، چکی کے گدھے سے بہتر نہیں ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے: المتعبّد علی غیر فقه کحمار الطاحونة یدور ولا یبرح ورکعتان من عالم خیر من سبعین رکعة من جاهل لأنّ العالم تأتیه الفتنة، فیخرج منها بعلمه وتأتی الجاهل فینسفه نسفا[3] یعنی: "فہم کے بغیر عبادت کرنے والے کی مثال چکی کے گدھے کی سی ہے کہ جو چلتا رہتا ہے لیکن سفر طے نہیں کرتا اور عالم کی دو رکعت نماز جاہل کی ستر رکعت نماز سے بہتر ہے کیونکہ عالم کو فتنہ پیش آتا ہے تو وہ اُس فتنے سے اپنے علم کے ذریعے نجات پا جاتا ہے لیکن جب جاہل کو فتنہ پیش آتا ہے تو اسے یہ فتنہ ریزہ ریزہ کر کے اڑا لے جاتا ہے۔"

خلاصہ یہ کہ جس شخص کے پاس عقلی معرفت نہ ہو، وہ انسانیّت کے جرگے سے باہر ہے کیونکہ انسان سمع و بصر اور عقل و شعور اور ان کے نتیجے میں ارادہ و اختیار کی نعمت سے مالا مال ہے اور جب انسان اپنی عقل کی متاع گنوا دیتا ہے اور عقل کے ضابطے توڑ دیتا ہے تو اپنی انسانیّت کا نایاب جوہر گنوا دیتا اور اپنی توحیدی و انسانی فطرت پر باقی نہیں رہتا۔

2. وہ آیات جن میں قرآن اپنے قاری کو قرآنی آیات پر عقلی ضابطوں کو بالائے طاق رکھ کر ٹوٹ پڑنے سے روکتی اور عقل کی پیروی کو قرآن و حدیث کے فہم کی اساسی شرط قرار دیتی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا[4] یعنی: "اور (خدائے رحمٰن کے بندے) وہ ہیں کہ جب انہیں ان کے رب کی آیتوں کے ذریعے نصیحت کی جاتی ہے تو ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے۔" اس آیت میں عباد الرحمٰن کی ایک اہم خصوصیت یہ بیان ہوئی ہے کہ جب ان کے سامنے ان کے ربّ کی آیات رکھی جاتی ہیں تو وہ عقل و منطق کی روشنی میں قرآنی آیات میں غور و فکر کرتے اور ان سے ضیاء پاتے ہیں اور ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے۔ اس آیت کے حوالے سے ابو بصیر سے یہ روایت نقل ہوئی ہے کہ انہوں نے کہا: سألت أبا عبد الله (علیه السلام) عن قول الله عزّوجل: " وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا "؟ قال: مستبصرين ليسوا بشكاك[5] یعنی: "میں نے ابوعبد اللہ (امام صادق علیہ السلام) سے پوچھا کہ: "اور (خدائے رحمٰن کے بندے) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ان کے رب کی آیتوں کے ذریعے نصیحت کی جاتی ہے تو ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے۔" کا مطلب کیا ہے؟" آپ (علیہ السلام) نے فرمایا: "وہ بصیرت رکھتے ہیں، اہل شک نہیں۔"

مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں عظیم مفسّر قرآن، علامہ طباطبائی کا بیان یہ ہے: والمعنی: والذين إذا ذكروا بآيات ربهم من حكمة أو موعظة حسنة من قرآن أو وحي لم يسقطوا عليه وهم صم لا يسمعون وعميان لا يبصرون بل تفكروا فيها وتعقلوها فأخذوا بها عن بصيرة فآمنوا بحكمتها واتعظوا بموعظتها وكانوا على بصيرة من أمرهم[6] یعنی: "معنی یہ ہے کہ خدائے رحمٰن کے بندے وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں حکمت اور وعظ و نصیحت پر مشتمل اپنے ربّ کی قرآنی اور وحیانی آیات یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ بہرے اور اندھے ہو کر ان پر نہیں گر پڑتے، بلکہ ان میں غور و خوض اور سوچ بچار کرتے ہیں اور ان آیات کو بصیرت کے ساتھ لیتے اور ان کی حکمت پر ایمان لاتے اور ان کے موعظہ سے نصیحت پاتے ہیں اور وہ اپنے امر میں بابصیرت ہوتے ہیں۔"

سورہ یونس میں بھی قرآن کریم نے عقل کی پیروی کو قرآن و حدیث کے فہم کی اساسی شرط قرار دیا ہے: اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ[7] یعنی: "تو کیا آپ بہروں کو سنائیں گے، خواہ وہ عقل سے کام نہ بھی

لیں۔" اس آیت میں نبی کریم ﷺ سے "استماع" کو عقل سے کام لینے پر معلّق کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص عقل سے کام نہ لے، وہ وحی و رسالت کا سامع قرار نہیں پا سکتا۔ اسی طرح قرآن کریم کافروں کو عقل کی پیروی نہ کرنے کے بموجب بہرہ، گونگا اور اندھا قرار دیتے ہوئے یہ رہنمائی فرماتا ہے کہ کافروں کے کفر میں مبتلا ہونے کا اصل سبب، عقل کی پیروی نہ کرنا ہے۔[8] اس نکتہ پر ایک اور مقام پر قرآن کریم یوں تصریح فرماتا ہے: مَا جَعَلَ اللهُ مِن بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ وَلَا حَامٍ ۙ وَلَٰكِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يَفْتَرُونَ عَلَى اللهِ الْكَذِبَ ۖ وَأَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ[9]۔ یعنی: "اللہ نے نہ تو بحیرہ کو، نہ سائبہ کو، نہ وصیلہ کو اور نہ حام کو، کسی کو بھی شرعی امر قرار نہیں دیا؛ لیکن کافر لوگ اللہ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہیں اور ان میں سے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے۔"

3. وہ آیات جن میں قرآن کریم نے ایسے اشخاص کو جو عقل سے کام نہیں لیتے نجس، چوپائے یا چوپایوں سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ[10] یعنی: "خدا ان لوگوں پر پلیدی ڈال دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔" اسی طرح ایک اور آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ[11] یعنی: "بے شک اللہ کے نزدیک جانداروں میں سب سے بدتر وہی بہرے، گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔" سورہ الفرقان میں بعض لوگوں کو چوپایوں سے بھی گمراہ تر قرار دیا گیا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو نبی کریم ﷺ کے فرامین کو سنتے ہیں، نہ عقل سے کام لیتے ہیں[12]۔

4. وہ آیات جن میں عالمِ ہستی کے مظاہر کو اُن لوگوں کے لئے توحید کی نشانیاں قرار دیا گیا ہے جو عقل کی پیروی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن کریم کے مطابق آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں، رات اور دن کی گردش میں سمندروں میں چلنے والی کشتیوں میں، بارش کے برسنے میں، زمین کے مُردہ ہو جانے کے بعد زندہ ہونے میں، زمین میں پھیلے ہر قسم کے جانور میں اور ہواؤں کے رُخ بدلنے میں اُن لوگوں کے لئے توحید کی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔"[13] اسی طرح دن رات، سورج، چاند اور ستاروں کی تسخیر میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں[14]۔ قرآن کریم ایک کلی ضابطے کے طور پر عالمِ ہستی میں توحید اور ربوبیّت کی نشانیوں کو محض انہی لوگوں کے ساتھ مخصوص قرار دیتا ہے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔[15]

5. وہ آیات جن میں تمام آسمانی کتابوں، منجملہ قرآن کریم کے ہدایت، نصیحت، آیات، اور عبرت ہونے کو صاحبانِ عقل کے لئے مختص کر دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: هُدًى وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ[16] یعنی: "(بنی اسرائیل کی کتاب بھی) عقل والوں کے لئے ہدایت ہے اور نصیحت ہے۔" ایک اور جگہ ارشاد ہے: إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ[17] یعنی: "بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور

شب و روز کی گردش میں صاحبانِ عقل کے لئے نشانیاں ہیں۔" قرآن کے مطابق قرآنی قصوں سے محض صاحبانِ عقل ہی عبرت حاصل کر پاتے ہیں: لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ[18] یعنی: " بے شک ان کے قصوں میں صاحبانِ عقل کے لئے عبرت ہے۔" ایک اور جگہ ارشاد باری ہے: هَلْ فِي ذَٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجْرٍ[19] یعنی: "آیا اس میں عقل مند کے لئے بڑی قسم نہیں ہے؟"

6. وہ آیات جن میں ملحدین، کافرین اور مشرکین کے ساتھ بحث میں عقل کو حق و حقیقت کی میزان قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنزِلَتِ التَّوْرَاةُ وَالْإِنجِيلُ إِلَّا مِن بَعْدِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ[20] یعنی: "اے اہلِ کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو؟ حالانکہ تورات اور انجیل تو ان کے بعد ہی نازل کی گئی تھیں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔" قرآن کریم کی کئی آیات عقلی ضوابط کی پیروی نہ کرنے کو وحی و رسالت کے انکار کا موجب قرار دیتی ہیں۔ منجملہ: قُل لَّوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُم بِهِ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ[21] یعنی: "فرما دیجئے: اگر اللہ چاہتا تو نہ ہی میں اس (قرآن) کو تمہارے اوپر تلاوت کرتا اور نہ وہ (خود) تمہیں اس سے باخبر فرماتا، بیشک میں اس (قرآن کے اترنے) سے قبل (بھی) تمہارے اندر عمر (کا ایک حصہ) بسر کر چکا ہوں، سو کیا تم عقل نہیں رکھتے۔"

7. وہ آیات جو انسان کی عقلی ضوابط سے روگردانی کو اُس پر ابلیس کی چیرہ دستی کا موجب قرار دیتی ہیں۔ ابلیس انسان کا قسم خوردہ دشمن ہے۔ ابلیس نے انسان کو گمراہ کرنے کی قسم کھائی ہے اور وہ انسان کے ساتھ اپنی دشمنی میں اس وقت کامیاب ہوتا ہے جب انسان عقل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے: وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا أَفَلَمْ تَكُونُوا تَعْقِلُونَ[22] یعنی: "اور بے شک اس نے تم میں سے بہت سی خلقت کو گمراہ کر ڈالا، پھر کیا تم عقل نہیں رکھتے تھے۔"

مذکورہ بالا آیات میں جو نکتہ قابل غور ہے وہ یہ ان میں سے اکثر آیات میں "عقل" کا مادہ "فعل" (يَعْقِلُوْنَ / لَا يَعْقِلُوْنَ) کی صورت میں استعمال ہوا ہے جو عقل کی قوّت سے کام لینے اور اسے استعمال میں لانے یا عقل کی طاقت سے کام نہ لینے پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح بعض آیات میں عقل کو "لبّ" اور "حجر" کا عنوان دیا گیا ہے جس میں اس امر کی طرف ایک ظریف اشارہ ہے کہ جو لوگ عقل کی پیروی نہیں کرتے وہ انسانیّت کے جوہر سے محروم ہیں، جو نہ ہدایت پا سکتے ہیں، نہ مظاہرِ ہستی میں خدا کی توحید و ربوبیّت کو کوئی نشانی دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی تاریخِ بشریت سے کوئی عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ان آیات میں قرآن فہمی میں عقل سے کام لینے

اور عقلی ضابطوں کی پابندی کو مرکزیت حاصل ہے۔ بنابریں، مذکورہ بالاآیات قرآن فہمی میں عقل کی حجیت اور سندیت پر دلالت کرتی ہیں۔

## روایات میں عقل کی حجیّت

حضور اکرم ﷺ نے اپنی ایک نورانی حدیث میں فرمایا: یاعلی! العقل ما اکتسبت بہ الجنّۃ، وطلب بہ رضی الرحمن. یاعلی: إنّ أوّل خلق خلقه الله عزّوجلّ العقل فقال له: أقبل فأقبل ثم قال له: أدبرفأدبر، فقال: وعزّتي وجلالی ما خلقت خلقاهو أحبّ إليّ منك، بك آخذ، وبك أعطي، وبك أثيب وبك أعاقب .[23] یعنی: "اے علی! عقل وہ (طاقت) ہے جس کے ذریعے بہشت کمائی جائے اور (خدائے) رحمٰن کی رضا طلب کی جائے۔ اے علی! وہ سب سے پہلی مخلوق جسے اللہ عزّوجلّ نے خلق فرمایا، عقل ہے۔ (عقل کی تخلیق کے بعد) اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا: "آگے آؤ!" تو عقل (نے اطاعت کی اور) آگے بڑھی۔ پھر اسے حکم دیا: "پیچھے ہٹو!" تو عقل (نے اطاعت کی اور) پیچھے ہٹی۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "مجھے میری عزّت وجلال کی قسم! میں نے کوئی ایسی مخلوق خلق نہیں کی جو مجھے تجھ سے زیادہ محبوب ہو۔ میں تیرے ذریعے مؤاخذہ کروں گااور تیرے ذریعے عطا کروں گااور تیرے سبب ثواب دوں گااور تیرے سبب عقاب دوں گا۔"

پیغمبر اکرم ﷺ سے یہ روایت بھی نقل ہوئی ہے کہ آپ نے فرمایا: یاعلی! لا فقر أشدّ من الجهل، ولا مال أعود من العقل[24] یعنی: "اے علی! جہل سے بڑا فقر اور عقل سے بڑھ کر کوئی مفید دولت نہیں ہے۔" خود حضرت علی علیہ السلام سے بھی یہی مطلب نقل ہوا ہے۔ آپ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا: ایّها الناس انّه لا مال (هو) اعود من العقل و لا فقر (هو) اشدّ من الجهل[25] یعنی: "اے لوگو! عقل سے بڑھ کر کوئی منافع بخش ثروت نہیں اور جہل سے زیادہ شدید کوئی فقر نہیں ہے۔" عبد اللہ ابن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ ہمیں صفیں درست کرنے کا حکم دیتے اور فرماتے تھے: لِيَلِنِي مِنْكُمْ أُولُو الْأَحْلَامِ وَالنُّهَى ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ[26] یعنی: "تم میں سے جو عقلمند اور سمجھدار ہوں وہ میرے قریب کھڑے ہوں، پھر وہ جو عقل و فہم میں اُن سے کم تر، پھر وہ جو (اس وصف میں) ان سے کم تر ہوں۔"

حضرت علی علیہ السلام نے اپنے ایک خطبے میں انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا ہدف انسان کے اندر رکھے گئے عقلی دفینوں کو منظر عام پر لانا قرار دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: بعث فيهم رسله و واتر اليهم انبيائه ليستادوهم ميثاق فطرته و... يثيروا لهم دفائن العقول[27] یعنی: "اللہ تعالیٰ نے ان میں اپنے رسول بھیجے اور پے در پے انبیاء کا سلسلہ قرار دیا تاکہ اس کی فطرت کا میثاق انہیں یاد دلائیں اور (اندھی تقلید اور

ضلالت و گمراہی کی تاریکی کے) پردوں تلے دبی عقول کو باہر نکال کر استعمال میں لائیں ۔"حضرت امام علی علیہ السلام کا فرمان ہے کہ: "الانسان بعقلہ" [28] یعنی: "انسان کی انسانیّت کا دار ومدار اُس کی عقل پر ہے۔" اسی طرح آپ کا ارشاد ہے: "اصل الانسان لبہ و عقلہ و دینہ" [29] یعنی: "انسان کی اساس اس کی عقل و خرد اور دین ہے۔"

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی ایک ایسی ہی روایت نقل ہوئی ہے: قال: لما خلق الله العقل استنطقه ثم قال له: أقبل فأقبل ثم قال له: أدبر فأدبر ثم قال: وعزّتي وجلالي ما خلقت خلقا هو أحبّ إلى منك ولا أكملتك إلا فيمن أحبّ، أما إنّي إياك آمر وإياك أنهى وإياك أعاقب وإياك أثيب. [30] یعنی: "آپ (علیہ السلام) نے فرمایا: جب اللہ (عزّوجلّ) نے عقل کو خلق فرمایا تو اسے بلوایا اور حکم دیا: "آگے آؤ!" تو عقل (نے اطاعت کی اور) آگے بڑھی۔ پھر اسے حکم دیا: "پیچھے ہٹو!" تو عقل (نے اطاعت کی اور) پیچھے ہٹی۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "مجھے میری عزّت وجلال کی قسم! میں نے کوئی ایسی مخلوق خلق نہیں کی جو مجھے تجھ سے زیادہ محبوب ہو اور میں نے تجھے اپنے محبوب افراد کے علاوہ کسی میں کامل نہیں کیا۔ پس میں تجھے امر کروں گا اور تجھے نہی کروں گا اور تجھے عقاب دوں گا اور تجھے ثواب دوں گا۔"

حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں آیا ہے کہ: "یا هشام ان لله على الناس حجتين، حجة ظاهرة وحجة باطنة فاما الظاهرة الرسل و الانبياء و الائمة و اما الباطنة فالعقول" یعنی: "اے ہشام اللہ تعالیٰ کی لوگوں پر دو حجتیں ہیں۔ ایک ظاہری حجت اور ایک باطنی حجت؛ ظاہری حجت رُسل، انبیاء اور ائمہ ہیں اور باطنی حجت عقول ہیں۔" [31] آپ علیہ السلام سے ایک دوسری روایت یوں نقل ہوئی ہے: "حجة الله على العباد النبي و الحجة فيما بين العباد و بين الله العقل" یعنی: "بندوں پر اللہ کی حجت نبی ہیں اور بندوں اور خدا کے درمیان حجت عقل ہے۔" [32] اسی مضمون کی روایت حضرت امام کاظم علیہ السلام سے بھی منقول ہے۔ [33]

مجلسی علیہ الرحمہ نے بحار الانوار میں امام رضا علیہ السلام سے ابن سکیت نے یہ روایت نقل کی ہے: في خبر ابن السكيت قال فما الحجة على الخلق اليوم؟ فقال الرضا (عليه السلام) العقل. تعرف به الصادق على الله فتصدقه و الكاذب على الله فتكذبه [34]۔ یعنی: "ابن سکیت کی روایت میں آیا ہے کہ میں نے پوچھا: اِس دَور میں خلقِ خدا پر خدا کی حجت کیا ہے؟ امام رضا (علیہ السلام) نے فرمایا: عقل؛ عقل کے ذریعے اللہ پر سچ بولنے والا پہچانا جاتا ہے کہ تو اس کی تصدیق کر سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولنے والا بھی عقل کے ذریعے پہچانا جاتا ہے کہ تو اس کی تکذیب کر سکتا ہے۔"

اب تک کی بحث کا خلاصہ یہ کہ قرآن کریم کی بیسیوں آیات اور ہادیانِ دین کی بیسیوں روایات عقل مندی کی مدح و ستائش اور بے عقلی کی مذمّت کرتی اور ہر حال میں عقل کی پیروی پر تاکید کرتی ہیں۔ اُن تمام آیات و روایات کا بیان اس مختصر مقالے میں ممکن نہیں جو اس مدعیٰ پر دلالت کرتی ہیں، لیکن نمونے کی مذکورہ بالا آیات و روایات سے بڑی آسانی سے یہ نتیجہ لیا جاسکتا ہے کہ عقل اللہ تعالیٰ کی اللہ کے بندے پر حجّت ہے اور عقلی ضابطوں کی پیروی، دین فہمی اور قرآن فہمی کا اساسی اصول ہے۔ عقل کی حیثیّت کے حوالے سے استاد محمود العقاد کا بیان بھی بالکل منطقی اور متین ہے کہ: "قرآن کریم عقل کا ذکر صرف وہاں کرتا ہے جہاں عقل کی تعظیم مقصود ہوتی ہے،اور جہاں اس کے مطابق عمل کرنے اور اس کی طرف رجوع کرنے کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ اور پھر یہ تذکرہ آیتوں کے سیاق میں ضمنی یا اتفاقی طور سے نہیں ہوتا، بلکہ ہر جگہ لفظ اور دلالت کی تاکید کے ساتھ ہوتا ہے۔ امر اور نہی کے ہر موقعہ پر اس کی تکرار ہوتی ہے، جہاں مومن کو اپنی عقل کو حکم بنانے پر ابھارا جاتا ہے، یا منکر کو عقل کے بارے میں لاپرواہ ہونے اور اس پر پابندی قبول کرلینے پر ملامت کی جاتی ہے۔"[35]

اس حوالے سے امام فراہی کا بیان بھی بالکل درست ہے کہ: "عقلی استدلال ہی وہ کسوٹی ہے جس سے سارے مذاہب کے بارے میں فیصلہ کیا جاتا ہے، اگر وہ نہ ہو تو حق اور باطل کے درمیان فرق محض من مانی اور زبردستی کی بنیاد پر رہ جائے گا۔" وہ مزید لکھتے ہیں: "نبوت اور وحی پر ایمان اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے جسے عقل قبول کرتی ہے اور جس پر دل مطمئن ہوجاتا ہے، اسی لئے وحی کی آمد دلائل کے ساتھ ہوتی ہے۔"[36]

## قرآن کی عقل پروری

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ قرآن کریم عقل کا امام ہے اور عقل پرور ہے۔ ہم اس مقالہ کی ابتداء ہی میں بتاچکے ہیں کہ انسانی عقل کے بارے میں قرآنی تعلیمات کی کا نچوڑ دو چیزیں ہیں: ایک، عقل کی پیروی اور دوسری، عقل پروری۔ جہاں تک قرآن کی عقل پروری کا تعلق ہے تو اس حوالے سے ہم یہ کہیں گے کہ انسانی عقل، اگرچہ اپنے بنیادی احکام و ضوابط میں مستقل اور خدا کے بندوں پر خدا کی حجّت ہے، لیکن یہی عقل قرآنی ہدایت و ارشاد کے سائے میں پروان چڑھتی ہے۔ کم از کم 8 مقامات پر قرآن کریم نے نزولِ قرآن کی یہی غرض و غایت بیان کی ہے۔[37] ارشادِ ربّانی ہے: إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ۔[38] یعنی: "بے شک ہم نے اِس کتاب کو قرآن کی صورت میں عربی زبان میں اتارا ہے تاکہ تم عقل پاسکو۔" قرآن کی عقل پروری کے حوالے سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ[39] یعنی: "اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم تاکہ تم عقل پا

سکو۔" ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے: قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ[40] یعنی: " اور بے شک ہم نے تمہارے لئے نشانیاں واضح کر دی ہیں تاکہ تم عقل پا سکو۔" مزید ارشاد ہے: اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ[41] یعنی: " بے شک ہم نے اس کتاب کو قرآن کی صورت میں بزبانِ عربی اتارا تاکہ تم عقل پا سکو۔" ایک اور جگہ ارشاد ہوا: اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ[42] یعنی: " بے شک ہم نے اسے عربی (زبان) کا قرآن بنایا ہے تاکہ تم عقل پا سکو۔"

اسی طرح کم از کم دو آیات[43] میں قرآن کریم کی نورانی آیات کے نزول اور ان میں غور و خوض کی غرض و غایت "لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْن" (تاکہ تم سوچ سکو) بیان ہوئی ہے۔ ایک آیت میں قرآن کریم کے نزول کی غرض و غایت "وَلِيَتَذَكَّرَ" (تاکہ نصیحت پا سکیں) بیان ہوئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ[44] یعنی: "یہ کتاب برکت والی ہے جسے ہم نے آپ کی طرف نازل فرمایا ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور و فکر کریں اور عقل مند اس سے نصیحت حاصل کریں۔" مزید ارشاد ہوا: وَأَوْرَثْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ هُدًى وَّذِكْرٰى لِأُولِي الْاَلْبَابِ[45] یعنی: "اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب کا وارث بنایا جو عقل والوں کے لئے ہدایت اور نصیحت ہے۔" ایک اور مقام پر ارشاد ہوا: اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ[46] یعنی: " بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور شب و روز کی گردش میں صاحبانِ عقل کے لئے نشانیاں ہیں۔" تاکید مزید یہ ہے کہ: لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ[47] یعنی: " بے شک ان کے قصوں میں صاحبانِ عقل کے لئے عبرت ہے۔"

جن آیات میں " تَتَفَكَّرُوْن "، " لِّيَدَّبَّرُوْ " اور " وَلِيَتَذَكَّرَ " فعل کی صورت میں بیان ہوئے ہیں اُن میں اِس امر کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کریم کے نزول کا ہدف انسان کی عقل کی قوّت کو فعلیّت تک پہنچانا ہے۔ یقینا ان آیات میں قرآن کریم کی عقل پروری کی طرف واضح اشارات موجود ہیں جن سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ قرآن کریم عقل کا امام اور عقل پرور ہے۔

## ایک غلط فہمی کا ازالہ

ممکن ہے مذکورہ بالا بحث کے مطالعہ سے ہمارے قاری کے ذہن میں یہ غلط تاثر قائم ہو جائے کہ مطالعہ قرآن کا پانچواں اساسی اصول، قرآن کو اپنے مقام و منزلت سے اتار کر عقل کے تابع بنا دیتا ہے۔ اور یہ قرآن کی شان میں گستاخی ہے۔ اسی طرح ایک قاری کے ذہن میں یہ غلط تاثر بھی قائم ہو سکتا کہ یہ دعویٰ کہ قرآن بیک وقت عقل

پیروی کی تعلیم بھی دیتا ہے اور عقل پروری کا اہتمام بھی کرتا ہے، ایک ناسازگار Self-contradictory دعویٰ ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو عقل پرور ہو، وہ عقل کی پیروی کی تعلیم بھی دے؟

ہم یہاں دونوں غلط فہمیاں دُور کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا اصرار ہے کہ عقلی ضوابط کی روشنی میں قرآن فہمی کے اصول کا مطلب قطعاً یہ نہیں کہ قرآن عقل کے تابع ہے۔ ہر گز ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ جو عقل کے تابع نہیں، بلکہ اکثر مقامات پر عقل کا امام ہے، وہ "قرآن" ہے جو ایک آسمانی اور وحیانی حقیقت ہے۔ لیکن وہ جس کے لئے عقلی ضوابط کی پیروی لازمی ہے وہ قرآن کا "فہم" ہے جو ایک زمینی اور بشری حقیقت ہے۔ کہاں فہم اور کہاں قرآن! "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔" قرآن کریم کا تعلق مبدءِ ہستی، جبرائیلِ امین اور قلب مقدسِ پیغمبر اکرم ﷺ اور حاملینِ وحی علیہم السلام سے ہے۔

جہاں تک قرآن فہمی کا تعلق تو اس کا ظرف غیر معصوم انسانوں کے دل و دماغ ہیں۔ اِس کا تعلق اصحاب و تابعین، محدثین، متکلمین، اصولیین، فقہاء، بیضاوی، عیاشی، ابن تیمیہ، ابراہیم قمی، ابن کثیر، سید رضی، سیوطی، شیخ طوسی، فخر رازی، طبرسی، آلوسی اور طباطبائی جیسے مفسرین سے لے کر قرآن کے ایک عام قاری سے ہے۔ عام انسانوں میں سے کسی کا قرآنی فہم، لزومی طور پر قرآن نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن کو سمجھنے میں عقلی اصول و ضوابط کی پیروی کریں اور ان سے تجاوز نہ کریں۔

ہمارے اس مؤقف پر استاد جوادی آملی کا بیان سند ہے۔ ان کے بقول: "قرآن کا وحیانی مضمون و محتوا معصومینؑ کی دسترس میں ہے: "إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ" [48] (یہ قرآن یقینا بڑی عظمت والا ہے جو ایک محفوظ کتاب میں ہے۔ اس کو پاک لوگوں کے سوا کوئی نہیں چھُو سکتا۔) فلسفی، فقیہ، متکلم اور مفسّر کا کبھی معصوم (نبی و وصّی) کے ساتھ موازانہ نہیں کیا جا سکتا۔ پیغمبر اکرم ﷺ کے حکمت آمیز کلمات میں آیا ہے: "لا یقاسُ بنا احد" [49] (ہمارے ساتھ کسی کا موازانہ نہیں کیا جا سکتا۔)" [50] بنابریں، اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ عقلی اصول و ضوابط کی پابندی قرآن فہمی کا اساسی اصول ہے تو قطعاً اس کا مطلب یہ نہیں کہ عقل کو قرآن کریم پر کوئی برتری حاصل ہے۔ ہماری مراد محض یہ ہے کہ قرآن کا ہر غیر معصوم بشری فہم، عقل کے کلی ضابطوں کے ماتحت ہونا چاہیے۔

باقی رہا یہ سوال کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو عقل پرور ہو، وہ عقل کی پیروی کی تعلیم بھی دے؟اِس سوال کا جواب بھی بڑا واضح ہے۔ قرآن عقل پرور ہے اور اپنے مخاطب کو حکم دیتا ہے کہ وہ عقلی ضوابط کی روشنی میں قرآنی ہدایت و ارشاد سے مستفید ہونے کی کوشش کریں۔ چاہے یہ عقلی ضوابط قرآنی پرورش سے پہلے عقل کشف کر

چکی ہو، جہاں عقل انہیں قرآن کی گود میں پرورش پانے کے بعد درک کرے۔ دونوں صورتوں میں قرآن کے قاری کا یہ فریضہ ہے کہ اُس کا قرآنی فہم عقلی اصول و ضوابط سے متصادم نہ ہو۔

## چند اہم سوالات

مطالعۂ قرآن کے پانچویں اساسی اصول کی بحث ہنوز تشنۂ تکمیل ہے۔ ابھی چند اہم سوالات کا جواب دینا اور بعض بنیادی ابہامات کو دُور کرنا باقی ہے۔ منجملہ یہ سوال کہ جس عقل کے ضابطوں کی پابندی قرآن فہمی کا اساسی اصول ہے، اُس کا معنی و مراد کیا ہے؟ یہ عقلی ضابطے کیا ہوتے ہیں؟ اگر ہر شخص اپنی ناقص عقل سے اپنے ضابطے بناتا جائے تو کیا قرآن فہمی میں اِن ضوابط کی پیروی ضروری ہو گی؟ آیا عقل سے اجتماعی عقل مراد ہے یا فلسفی عقل؟ آیا انسانی اور سائنسی علوم کے مختلف شعبوں میں دریافت شدہ علمی حقائق کا شمار بھی عقلی اصول و ضوابط میں ہو گا یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ سوالات ہیں کہ جب تک ان کا تسلی بخش جواب نہ دیا جائے، فکری طور پر مطالعۂ قرآن کے پانچویں اصول کو تسلیم کرنا مشکل اور عملی میدان میں اِس کی پیروی مشکل تر ہے۔ ذیل کی بحث میں ایسے سوالات کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے۔

## عقل کا معنی و مفہوم

عقل کے کلمے کا اطلاق، مختلف معانی پر ہوا ہے۔ جوہری نے الصحاح میں عقل کا لغوی معنی "روکنا" اور "منع کرنا" اور "پناہ گاہ" بیان کیا ہے۔[51] شمعون بن لاوی کے ایک سوال کے جواب میں پیغمبر اکرم ﷺ سے منسوب ایک روایت میں عقل کو جہل سے مانع قرار دیا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "ان العقل عقال من الجہل"[52] یعنی: "عقل، جہل سے مانع ہے۔" تاج العروس میں الزبیدی نے لکھا ہے کہ: "العقل، العلم، و علیہ اقتصر کثیرون" یعنی: "عقل، علم ہے اور اکثر نے اسی تعریف پر اکتفاء کیا ہے۔" الزبیدی آگے چل کر لکھتا ہے: قال الراغب: العقل یقال للقوة المتهیئة لقبول العلم، ویقال للذی یستنبطه الإنسان بتلك القوة عقل. ولهذا قال علی رضی الله تعالی عنه: العقل عقلان: مطبوع ومسموع، فلا ینفع مطبوع إذا لم یکن مسموعا، کما لا ینفع ضوء الشمس وضوء العین ممنوع. وإلى الأول أشار النبی صلی الله علیه وسلم: " ما خلق الله خلقا أکرم من العقل"، وإلى الثانی أشار بقوله: " ما کسب أحد شیئا أفضل من عقل یهدیه إلى هدی أو یرده عن ردی". وهذا العقل هو المعنی بقوله عزوجل: (وما یعقلها إلا العالمون) وکل موضع ذم الله الکفار بعدم العقل فإشارة إلى

الثاني دون الأول ، كقوله تعالى : ﴿صم بكم عمى فهم لا يعقلون﴾ ونحو ذلك من الآيات، وكل موضع رفع التكليف عن العبد لعدم العقل فإشارة إلى الأول۔ "[53]

یعنی: " راغب کا کہنا ہے کہ عقل، علم کے قبول کرنے کے لئے آمادہ طاقت کا نام ہے۔ اور اس قوت کی مدد سے انسان جو علم حاصل کرتا ہے اسے بھی عقل کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے کہ میں نے عقل کو دو طرح کا پایا: ایک مطبوع اور دوسرا مسموع؛ پس جب تک مسموع نہ ہو تو مطبوع کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا؛ بالکل ویسے جیسے آنکھ میں نور نہ ہو تو سورج کی روشنی کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی۔ اور عقل کے پہلے معنی (یعنی علم کے قبول کی قوّت) کی طرف نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے: "اللہ تعالیٰ نے عقل سے زیادہ باکرامت کوئی مخلوق خلق نہیں فرمائی۔" اور عقل کے دوسرے معنی (یعنی علم) کی طرف آپ ﷺ نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے: " کسی شخص نے اُس عقل سے افضل کچھ نہیں کمایا جو عقل ہدایت کی طرف رہنمائی کرے اور اور اسے گمراہی سے بچائے۔" اور اللہ تعالیٰ کے فرمان: وما یعقلها إلا العالمون میں عقل سے مراد، عقل کا یہی دوسرا معنی ہے۔ اور جن مقامات پر اللہ تعالیٰ نے کفار کی بے عقل ہونے پر مذمت فرمائی ہے جیسے صم بکم عمی فهم لا یعقلون جیسی آیات میں تو وہاں کافروں کے بے عقل ہونے سے مراد یہی دوسرا معنی مراد ہے؛ نہ کہ پہلا معنی ( کیونکہ پہلے معنی میں تو کافر بھی صاحبان عقل ہیں) اور شریعت میں جہاں عقل نہ ہونے کی وجہ سے شرعی ذمہ داری اٹھائی گئ ہے تو وہ عقل سے مراد، اُس کا پہلا معنی ہے۔" اس آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص علم کے حصول کی قوت سے محروم ہو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے فرائض نہیں رکھے۔

مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں، عقل کے دو عمدہ معانی سامنے آئے ہیں: 1) وہ نفسانی طاقت اور قوت جو اللہ تعالیٰ نے بطور کلی ہر انسان کو عطا کی ہے جس کے وسیلے سے وہ معانی کا تصور، قضایا کی ترکیب اور قیاسات انجام دیتا ہے۔ 2) بذات خود وہ ادراکات جو انسان اِس خداداد قوّت کے سہارے حاصل کرتا ہے۔ یاد رہے! ہمارے اِس مقالہ میں عقل اور عقلی اصول و ضوابط سے عقل کا دوسرا معنی، یعنی عقلی ادراک مراد ہے۔ کیونکہ عقل جب تک ایک نفسانی قوّت کی حیثیت میں باقی رہ جائے اور ادراکات و معانی اور احکام و قضایا کا ارمغان نہ لائے تو بے سود ہے اور یہ وہی مطلب ہے جس کی طرف امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے اُس فرمان میں اشارہ ہوا ہے جو الزبیدی سے اوپر کی عبارت میں نقل ہوا ہے۔

## عقلی ادراک

محققین نے انسانی ادارک کے تین مراتب بیان کیے ہیں: حسی ادراک؛ خیالی ادراک اور عقلی ادراک۔ **حسی ادراک** اُن صورتوں کا نام ہے جو ذہن میں اُس وقت منعکس ہوتی ہیں جب انسان کے حواس پنجگانہ میں سے کوئی ایک (یا ایک سے زیادہ) حس حرکت میں آتی ہے۔ مثال کے طور پر جب انسان آنکھیں کھولتا ہے اور ایک منظر اپنے سامنے دیکھتا ہے تو اس منظر سے اس کے ذہن میں ایک تصویر منعکس ہوتی ہے۔ واضح رہے حسّی ادراک اُس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک انسان کے حواس پنجگانہ میں سے کسی ایک حس کا محسوس شدہ چیز کے ساتھ رابطہ برقرار رہتا ہے۔

جب حسّی ادارک ختم ہو جاتا ہے تو یہ ادراک، انسان کے ذہن میں اپنا ایک خاص اثر چھوڑ جاتا ہے۔اِس اثر کو "خیالی ادراک" یا خیالی صورت کا نام دیا جاتا ہے۔ حسّی اور خیالی صورت میں فرق یہ ہے کہ حسی صورت ہمیشہ ایک **خاص وضع** (آس پاس کی چیزوں سے ایک خاص سمت میں ہونا) ایک **خاص جہت** (آس پاس کی چیزوں کے ساتھ ایک خاص زاویہ پر ہونا، مثال کے طور پر دائیں یا بائیں یا آگے یا پیچھے ہونا) اور ایک **خاص مکان** میں پائی جاتی ہے۔ لیکن خیالی ادراک کسی خاص وضع، سمت یا مکان کا محتاج نہیں ہوتا۔ اسی طرح خیالی ادراک، عالمِ خارج کی اشیاء کے ساتھ رابطے کا محتاج نہیں ہے۔ خیالی ادراک جزئی ہوتا ہے، یعنی ایک سے زیادہ افراد پر لاگو نہیں ہو سکتا۔ لیکن انسان کی عقلی طاقت، خیالی ادراک کی مدد سے ایک ایسا معنی بناتی ہے جو ایک سے زیادہ افراد پر صادق آسکتا ہو۔ایسے تصور کو "عقلی ادراک" کا نام دیا جاتا ہے۔[54]

یاد رہے! اِس مقالہ میں عقل اور عقلی اصول و ضوابط سے مراد، عقلی ادارک ہے، حسی یا خیالی ادراکات مراد نہیں ہیں۔

## عقل کی اقسام

اربابِ فن کے ہاں عقل اپنے رائج معنی یعنی "ادراکات و احکام" کے لحاظ سے دو قسموں میں تقسیم ہوتی ہے: ایک، نظری عقل اور دوسری، عملی عقل۔اسی طرح بعض محققین نے عقل کی چند دیگر اقسام بھی بیان کی ہیں جن میں "مفتاحی عقل"، "مصباحی عقل" اور "آلی عقل" کی اقسام قابلِ ذکر ہیں۔اِن اقسام کی توضیح و تشریح میں یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ عقل بمعنی "القوة المتهيئة لقبول العلم" (علم و ادارک کے حصول کے لئے آمادہ قوّت) ایک بسیط حقیقت ہے جسے مختلف اقسام میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ بنابریں، اربابِ فن کے ہاں عقل کی مختلف اقسام، درحقیقت، عقل کے مدرَکات کی اقسام ہیں۔ چونکہ عقل کے مدرَکات کی مختلف اقسام ہیں، ان اقسام

کے لحاظ سے عقل کو اس کے متعلقات کا نام دیتے ہوئے مختلف اقسام میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ بقول استاد محمد تقی مصباح: " فارابی، ملا ہادی سبز واری، محقق اصفہانی اور مرحوم مظفر کی پیروی میں ہمارا عقیدہ بھی یہی ہے کہ نظری اور عملی عقل کا اختلاف، عقل کی مدرَکات کی نوعیت سے وابستہ ہے۔۔۔ لہٰذا ہمارے نفس میں کوئی دو الگ ادراکی قوّتیں نہیں پائی جاتیں، بلکہ نفس میں محض ایک ادراکی قوّت پائی جاتی ہے لیکن چونکہ ادراک کا متعلق مختلف ہے لہٰذا عقل کو متعلق کے لحاظ سے نظری اور عملی کی دو اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔" 55

بنابریں، اگر عقل کے مدرَکات کا تعلق ہستی و نیستی یا دوسرے الفاظ میں What is کی کیٹیگری سے ہو تو اسے " نظری عقل" کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر عقل کے مدرَکات کا تعلق انسانی افعال یا دوسرے الفاظ میں What ought کی کیٹیگری سے ہو تو اسے " عملی عقل" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں عقل کے وہ ادراکات اور احکام جو یہ بتائیں کہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے، نظری عقل کہلاتے ہیں اور عقل کے وہ ادراکات اور احکام جو یہ بتائیں کہ انسان کو کیا انجام دینا چاہیے اور کیا انجام نہیں دینا چاہیے، عملی عقل کہلاتے ہیں۔ اسی طرح اگر عقل، علم و ادراک کے حصول کا منبع (Source) ہو اور وہ علم و ادراک تنہا عقلی تأملات کے ذریعے کشف ہوا ہو تو چونکہ وہاں عقل کی حیثیت اس علم و ادارک کے حصول کی چابی اور مفتاح کی ہوتی ہے، اسے مفتاحی عقل کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، اگر کسی علم و ادارک کے حصول کا منبع عقل کا غیر ہو، مثال کے طور پر ایک علم تنہا وحی و رسالت کے ذریعے سے کشف ہوا ہو تو چونکہ اس علم کے حصول میں عقل کی حیثیت محض ایک چراغ کی ہوتی ہے اسے "مصباحی عقل" کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اور اگر انسان عقل کی طاقت کے سہارے اپنے نفع کے حصول اور زیان سے بچنے اور اپنے امور کی تدبیر کے باب میں کسی ادارک تک پہنچے تو یہاں عقل کا نام "آلی عقل" رکھ دیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ نظری عقل کا کام آفاقی اور انفسی آیات میں تفکر اور تدبّر اور برہان و استدلال کے ذریعے خدا کے وجود اور صفات کو ثابت کرنا ہے۔ بعض محققین کے مطابق ہستی و نیستی کے ادارک کے ملازمات جیسے منعم و محسن کے شکر کی بجاآوری کے لزوم و وجوب کا فتویٰ دینا بھی نظری عقل کی شان و منزلت ہے۔ قرآن و سنّت میں عقلِ نظری کے ادراکات کی کئی مثالیں ڈھونڈی جا سکتی ہیں۔ منجملہ: فَلَمَّا جَآءَتۡهُمۡ اٰيٰتُنَا مُبۡصِرَةً قَالُوۡا هٰذَا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ۝ وَجَحَدُوۡا بِهَا وَاسۡتَيۡقَنَتۡهَاۤ اَنۡفُسُهُمۡ 56 یعنی: "جب ان کے پاس ہماری نشانیاں پہنچیں جنھوں نے ان کی آنکھیں کھول دیں تو کہنے لگے کہ یہ آشکار جادو ہے۔ اور انہوں نے ان نشانیوں کا انکار کر دیا حالانکہ ان کے نفس ان نشانیوں کا یقین پا چکے تھے۔" جس یقینی ادراک کی طرف " وَاسۡتَيۡقَنَتۡهَاۤ اَنۡفُسُهُمۡ "میں اشارہ کیا گیا ہے یہ عقل نظری کا

مصداق ہے۔ البتہ نظری عقل کی دریافتیں انگشت شمار ہیں۔ نظری عقل کا بنیادی ترین ادراک یہ ہے کہ "یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی چیز مثال کے طور پر پتھر بھی ہو اور پتھر نہ بھی ہو۔" اسی طرح "یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی چیز مثال کے طور پر نہ پتھر ہو اور نہ پتھر کے علاوہ کوئی اور چیز ہو۔" اربابِ فن کی اصطلاح میں نظری عقل کے اِس بنیادی ترین ادراک کو "اصلِ تناقض" کا نام دیا جاتا ہے۔ عقل نظری کا یہ ادراک، اُس کا "اوّلی حکم" قرار دیا گیا ہے جو دلیل سے غنی اور عقل کا وہ سرمایہ ہے جس کی بنیاد پر عقل کئی "بدیہی احکام" صادر کرتی ہے۔ مثال کے طور پر:

1. دو ضد کا اجتماع محال ہے۔
2. دو مثل کا اجتماع محال ہے۔
3. ایک چیز کی خود اپنے آپ سے نفی محال ہے۔

یاد رہے! نظری عقل اِن اوّلی اور بدیہی احکام کو سرمایہ بنا کر ان کے ملازمات کو ایسے کلی عقلی احکام و ضوابط کی شکل و صورت میں پیش کرتی ہے جن کی پابندی، قرآن فہمی کا پانچواں اساسی اصول ہے۔

جہاں تک عملی عقل کا تعلق ہے تو جیسا کہ اوپر اشارہ ہوا ہے، اہلِ فن کے ہاں اِس کا کام حَسَن اور قبیح کا ادراک ہے۔ بعض روایات میں بھی عقل کے اس معنی کی طرف اشارات ملتے ہیں۔ جیسا کہ پیغمبر اکرم ﷺ سے منقول ہے کہ: "جب انسان بلوغ کو پہنچتا ہے تو اس کے قلب میں ایک نور پیدا ہوتا ہے جس کے بعد وہ واجب اور مستحب اور نیکی اور برائی کو پہچاننے لگتا ہے۔ یقیناً دل میں عقل کی مثال گھر کے درمیان میں چراغ کی مثال ہے۔"[57] حضرت علی علیہ السلام سے منسوب ہے کہ آپ نے فرمایا: بعض روایات میں عملی عقل کی طرف ان الفاظ میں اشارہ ہوا ہے: "العقل ما عبد به الرحمن و اکتسب به الجنان"[58] اسی طرح ایک اور روایت میں پیغمبر اکرم ﷺ سے نقل ہوا ہے: "أَعْقَلُ النَّاسِ مُحْسِنٌ خَائِفٌ وَ أَجْهَلُهُمْ مُسِيءٌ آمِنٌ"[59] یعنی: "لوگوں میں سے عقل مند ترین شخص وہ ہے جو نیکوکار اور دل میں خوفِ خدا رکھنے والا ہو اور ان میں سے جاہل ترین شخص وہ ہے جو گناہکار اور عذاب الٰہی سے بے خوف ہو۔" ان روایات میں عقل کی اصطلاح کے ذریعے عقل کی جس قسم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ وہی عملی عقل ہے جس کا کام انسانی افعال کے حسن و قبح کا ادراک ہے۔ ہمارے نزدیک، انسانی افعال کا حسن و قبح، ذاتی اور عقلی ہے، نہ کہ شرعی اور اعتباری۔[60] نیز یہ کہ عملی عقل کی اوّلی، بنیادی اور جاودانی حکم: "عدل حسن ہے اور ظلم قبیح ہے۔" عملی عقل اپنے اس بنیادی ترین حکم کی بنیاد پر تمام اخلاقی احکام و قضایا تک رسائی پاتی ہے۔

یاد رہے! عقل عملی کے اصول و ضوابط کی پابندی بھی قرآن فہمی کا اساسی اصول ہے۔

جہاں تک عقل کے وسیلہ یا آلہ ہونے کا تعلق ہے تو یقیناً عقل میں یہ صلاحیت بھی پائی جاتی ہے جس کی طرف حضرت امام علی علیہ السلام سے منقول اس فرمان میں اشارہ ہوا ہے: "لوگوں میں سب زیادہ عقل مند وہ ہے جو اپنے معاش کی تنظیم اور تدبیر میں سب سے بہتر ہو۔"[61] تاہم یاد رہے! ہم آلی عقل کے ادراکات اور اصول و ضوابط کو قرآن فہمی کا اصول نہیں سمجھتے اور ہمارے خیال میں آلی عقل کا کام، انسان کو سود و زیاں کا احساس دلانا اور سود کے حصول کا چارہ کار ڈھونڈنا اور زیان سے بچنے کی تدابیر بتانا ہے۔ لیکن یہ تشخیص دینا کہ انسان کا حقیقی سود کیا ہے اور زیان کیا ہے، آلی عقل کی رسائی سے باہر ہے، بلکہ اس معاملہ میں قرآن آلی عقل کا رہبر و رہنما ہے اور آلی عقل کو قرآن کے ہدایت و ارشاد کی روشنی میں اپنے قاری کے سود و زیان کی فکر و تدبیر کرنی چاہیے۔

جہاں تک اِس سوال کا تعلق ہے کہ آیا جس عقل کے اصول و ضوابط کی پابندی قرآن فہمی کا اساسی اصول ہے، اُس سے محض فلسفی یا تجریدی عقل مراد ہے یا اِس میں سائنسی اور بشری علوم کے مسلمہ حقائق بھی شامل ہیں؟ تو اِس سوال کے جواب میں استاد جوادی آملی کے بیانات سے رہنمائی لیتے ہوئے ہمارا مؤقف بھی یہی ہے کہ تمام برہانی حقائق اُن عقلی اصول و ضوابط میں شامل ہیں جن کی پیروی قرآن فہمی کا اساسی اصول ہے۔

جوادی آملی کے مطابق: "اگرچہ مروّجہ اصطلاحات میں فزکس، کیمیا اور بیالوجی جیسے مختلف سائنسی اور انسانی علوم کے شعبوں کو "علم" کا نام دیتے ہوئے انہیں مطلق فلسفہ اور نظری عرفان سے الگ علوم قلمداد کیا جاتا ہے لیکن موجودہ مسئلہ پر جس زاویہ سے یہاں نظر ڈالی جارہی ہے اس کے لحاظ سے معرفت کے مختلف شعبے جو کہ عقل کی چار اقسام (سائنسی، نیمہ سائنسی، تجریدی اور خالص) کو بروئے کار لانے کا نتیجہ ہیں، اگر یقین آور ہوں یا حتی کہ اطمینان آور ہوں تو یہ سب علم شمار ہوتے ہیں اور نقل کے ساتھ ساتھ یہ بھی دین شناسی میں ایک خاص اہمیّت کے حامل ہیں۔"[62]

مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں اِس سوال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ عقل جس کے احکام اور ضابطے، قرآن فہمی کا اساسی اصول ہیں، آیا اُس سے مراد ہر فرد کی شخصی عقل اور فردی محاسبات ہیں یا اِس سے انسان کی اجتماعی عقل مراد ہے؟ یقیناً اس سوال کا جواب یہی ہے کہ جس طرح حاضر بحث میں انسانی عقل سے مراد، نہ انسان کے حسی ادراکات ہیں، نہ خیالی ادراکات اور ذہنی تصویریں مراد ہیں، نہ اِس سے مراد ذہنی تصویروں پر انسان کی قوّتِ وہم کی مشق آزمائی ہے؛ اسی طرح اس سے مراد ہر فرد کی شخصی عقل اور فردی محاسبات بھی مراد نہیں ہیں۔ یہاں عقل کی مثال باقی شعبہ ہائے زندگی کی ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں حقیقت، ایک ریاضی حقیقت ہے، یا مرض اور اس کی دوا، میڈیکل سائنس کی مسلمہ حقیقت اور حکم ہے تو اِس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے چند مسائل سے آشنا ہر شخص کی ہر بات سند اور میڈیکل سائنسز کی مبادیات سے آشنا ہر عطائی اور غیر عطائی ڈاکٹر کی بات

معتبر ہے۔ نہیں مراد یہ ہے کہ ان علوم کے مسلمات، حجّت ہیں اور شرعی امور میں بھی اُن مسلمّات کی پیروی ضروری ہے۔ جس طرح انجنئرنگ کے مسلمّات ایک بلڈنگ کی تعمیر کی اجازت نہ دے رہے ہوں تو وہ بلڈنگ بنانا گناہ ہے اور میڈیکل سائنسز کے مسلّمات کی روشنی میں اگر ایک غذا ضرر رساں ہو تو اُس کا کھانا گناہ ہے، اِسی طرح اگر منطقی، فلسفی، کلامی، اصولی اور فقہی مسلّمات قرآن کے کسی فہم سے مطابقت نہ رکھتے ہوں تو اُس فہم سے دستبرداری ضروری ہے۔ہاں! اگر معاملہ کسی ایک شخص کی فردی رائے کا ہو تو وہاں دوسروں کے لئے اس کی رائے کی پیروی میں قرآن فہمی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ باقی رہا اُس فرد کا ذاتی معاملہ تو یقینا اُس کے لئے پہلے مرحلہ میں متشرع عقلاء و مفسّرین کی عقل کے ادراکات میں مکمل فحص اور حقیقت کی تلاش ضروری ہے۔ اگر اس علمی کاوش میں اس کا موقف وہی بنے جو اہلِ فنون کا موقف ہے تو مسلّمات کی پیروی کرے۔ اور اگر اُس کی رائے مختلف ہو اور وہ اپنی علمی کاوش میں صادق ہو تو یقینا اُس کی رائے خود اُس کے لئے حجّت ہے جس کی پیروی اُس کا فریضہ ہے چاہے وہ اس میں خطاکار ہی کیوں نہ ہو۔ "للمصیب اجران وللمخطئی اجرواحد۔"

## نتائج

مذکورہ بالا بحث میں ہم نے تفصیلی استدلال و برہان کے ذریعے درج ذیل نتائج اخذ کیے ہیں:

1. قرآن کریم کی 7 قسم کی کم از کم 20 آیات کی روشنی میں انسان کی عقل، انسان کے لئے حجّت ہے اور انسان پر عقل کے احکام کی پیروی لازم ہے۔
2. معصومین علیہم السلام کی کم از کم 12 روایات کی روشنی میں انسان کی عقل، انسان کے لئے حجّت اور عقل کے احکام کی پیروی انسان پر لازم ہے۔
3. مطالعہ قرآن کے دوران، عقل کے احکام کی پیروی، قرآن فہمی کا اساسی اصول ہے۔
4. مذکورہ بالا شق میں عقل سے عقل کے تخلیقی اور کسبی تمام احکام مراد ہیں۔ عقل کے تخلیقی احکام سے مراد ایسے احکام جن کی خالق خود عقل ہے۔اور عقل کے کسبی احکام سے مراد وہ احکام ہیں جنہیں عقل قرآن کریم کی پرورش کی سائے میں کسب کرتی ہے۔
5. مطالعہ قرآن کے دوران، عقل کے احکام کی پیروی کے لازمی ہونے میں عقل سے اُس کی مروّجہ تقسیمات میں عقل کے تمام مفتاحی اور مصباحی مسلّمہ احکام مراد ہیں۔ اسی طرح نظری عقل اور عملی عقل کے تمام

مسلّمہ احکام بھی مراد ہیں۔ نیز تمام سائنسی اور انسانی علوم کے برہانی اور یقین و اطمینان آور احکام اور حقائق بھی اُن عقلی احکام میں شامل ہیں جن کی پیروی قرآن فہمی کا اساسی اصول ہے۔

## استدراک

ممکن ہے بعض قارئین مطالعۂ قرآن کے پانچویں اساسی اصول کو مجلّہ نور معرفت کے مسلسل شمارہ نمبر 23-22 میں بیان شدہ مطالعۂ قرآن کے تیسرے اساسی اصول کے ساتھ متصادم قرار دیں۔ کیونکہ ہم نے مطالعۂ قرآن کا تیسرا اساسی اصول یہ بیان کیا تھا کہ: "قرآن کریم اپنے مطالب کے بیان میں ریاضیات، نجوم، فلسفہ، نفسیات، عمرانیات، طبیعیات، غرض کہ اکثر دنیاوی علوم سے مدد لینے سے بے نیاز ہے۔ قرآن بشری علوم کا قائد، رہنما اور مرشد ہے، نہ کہ پیروکار۔"

ہم یہاں یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ مطالعۂ قرآن کے پانچویں اساسی اصول کا مدعیٰ یہ نہیں ہے کہ قرآن ایک صامت متن ہے جس کی تشریح محض بشری علوم کی روشنی میں ممکن ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ بقول استاد جوادی آملی: "اللہ تعالی نے تمام اسلامی اصولوں کی بابت قرآن کی جامعیت کو "تبیان" قرار دیا ہے۔ پس اس کتاب میں کوئی کمی نہیں پائی جاتی کہ باہر سے اُس کمی کا جبران کیا جائے؛ قرآن میں نہ قانون اور انسانی اصولوں کی کمی ہے، نہ شناخت اور اسلامی معارف کی کمی ہے اور نہ ہی ان مطالب کے بیان کی کمی ہے۔ یعنی قرآن اپنے مضامین و مطالب کے لحاظ سے بھی بیگانوں کے مطالب سے بے نیاز ہے اور ان مطالب کی تعلیم اور تفہیم میں بھی ایسا رسا بیان رکھتا ہے کہ دوسروں کی ترجمانی اور بیگانوں کے قلم سے بے نیاز ہے؛ کیونکہ ہر شئے کے لیے "تبیان" ہونے کا معنی یہی ہے۔"[63] پس قرآن فہمی میں عقلی اصول و ضوابط کی پیروی کے لزوم کا نتیجہ قرآن کی احتیاج نہیں ہے۔ کیونکہ:

1. سب سے پہلے تو ہم اِسی مقالے میں ثابت کر چکے ہیں کہ قرآن، عقل پرور ہے۔ جو عقل پرور ہو، وہ عقل کا محتاج نہیں ہوتا؛ جیساکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ عقل کا متضاد ہو۔
2. قرآن کی بہت سی تعلیمات ایسی ہیں جن کا تعلق عالمِ طبیعت کے ماوراء سے ہے۔ لہٰذا ان تعلیمات تک رسائی میں قرآن کے قاری کا ریاضیات، نجوم، نفسیات، عمرانیات اور طبیعیات کی تعلیمات سے لیس ہونا بالکل ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ بشری علوم کا موضوع کچھ اور ہے اور قرآن کا موضوع کچھ اور ہے۔ بشری علوم ہمیں عالم طبیعت پر حکمرانی عطا کرتے ہیں۔ طبیعی علوم مثال کے طور پر ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ ہم کیسے زمین

سے بہتر سے بہتر اور زیادہ سے زیادہ غلہ حاصل کر سکے ہیں، سمندروں کے بیکراں پانیوں پر کیسے اپنا راج قائم کر سکتے ہیں اور فضاؤں، خلاؤں کو حیلوں، حربوں سے اپنے پروں تلے روند سکتے ہیں۔ لیکن قرآن کا فہم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ تسخیر کائنات کے بعد ہمیں کیا کرنا ہے؟ مثال کے طور پر اپنے اُگائے ہوئے غلہ کو کیسے استعمال کرنا ہے؟ آیا اس پر کوئی زکات ادا کرنی ہے کہ جس سے چند فقیروں کا بھی گذر بسر ہو سکے یا اپنی بھوک مٹا لینے کے بعد اضافی غلہ دریاؤں اور سمندروں میں پھینک دینا ہے؟

3. جہاں تک سائنسی اور انسانی علوم کے برہانی اور یقین یا اطمینان آور احکام کا تعلق ہے تو یقینا ان کی پیروی قرآن فہمی کا اساسی اصول ہے؛ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن ان علوم کا محتاج ہے۔ کیونکہ قرآن نے بعض سائنسی اور انسانی تعلیمات ایک ایسے عصر میں بیان کیں جب ان علوم میں سے بعض نے ابھی جنم بھی نہیں لیا تھا اور جو جنم لے چکے تھے، ابھی بیسا کھیوں کے بل چل رہے تھے۔ پس قرآن بشری علوم کا قائد، رہنما اور مرشد ہے، نہ کہ پیروکار۔ ہاں! قرآن بشری علوم کے دائرہ کار میں ان علوم کے برہانی اور یقینی احکام کے ساتھ ہماہنگ ہے، برسرِپیکار نہیں ہے۔ اِن علوم کے احاطہ میں عقل کی سرچشمہ کی روشنی میں دریافت شدہ حقائق، بعض قرآنی آیات کی تفسیر میں معاون و مددگار ہیں۔

4. مطالعۂ قرآن کے پانچویں اساسی اصول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم سر سید احمد خان کی مانند مابعد الطبیعی حقائق کی طبیعی تاویلات پیش کرنا شروع کر دیں یا ڈاکٹر عبدالکریم سروش کی مانند سائنسی اور بشری علوم کے قبض و بسط کی بنیاد پر شریعت کے قبض و بسط کے قائل ہو جائیں۔ بنابریں، مطالعۂ قرآن کا پانچواں اساسی اصول نہ ہمیں سر سید احمد خان کی طرح میٹیریالزم کی دہلیز پر لا کھڑا کرتا ہے اور نہ ہی ڈاکٹر سروش کی مانند نسبیّت گرائی Relativism یا پلورالزم کا معتقد بناتا ہے۔

5. قرآن کریم کا بشری علوم کا محتاج نہ ہونا ایک امر ہے اور قرآن کریم سے استفادہ کے لیے قاری کا بعض علوم کے مسلّمات اور مہارتوں سے آشنائی کا محتاج ہونا ایک الگ امر ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کا قاری جس قدر ریاضیات، طبیعیات، نجوم، عمرانیات، تاریخ، خلاصہ یہ کہ بشری علوم اور مہارتوں سے بہتر آشنا ہو گا، اُسی قدر قرآن کریم سے بہتر رہنمائی حاصل کر پائے گا۔ کیونکہ قرآن کریم کے دوسرے علوم سے بے نیاز ہونے کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ: "انسان، قرآن کے ساتھ جاہلانہ انداز سے پیش آئے اور اُس نے جو علوم اور معارف

سیکھے ہیں، انہیں نظر انداز کر دے اور ایک ان پڑھ، جاہل مطلق کی حیثیت سے اِس عظیم الٰہی کتاب کے حضور حاضر ہو؛ کیونکہ (قرآن پر دیگر علوم کے) مطالب ٹھونسنے اور (قرآن سے دیگر علوم کی روشنی میں) مطالب حاصل کرنے میں فرق ہے۔ حق بات یہ ہے کہ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ انسانی معلومات کو وحی الٰہی پر ٹھونسے اور قرآن کو اپنی ہوا و ہوس کے تابع بنائے اور قرآن کی تفسیر اپنی مخصوص رائے کے مطابق کرے؛ لیکن علوم کو حاصل کرنا، دل کی ظرفیت کو بڑھا دیتا ہے اور اُسے قرآنی معارف پر توجہ دینے کے قابل بناتا ہے اور شرح صدر کا سبب بنتا ہے؛ "ان هذه القلوب اوعية فخيرها اوعاها"[64] (یہ دل ظرف ہیں، پس ان میں سے سب سے بہتر ظرف وہ ہے جو سب سے زیادہ بھرا ہوا ہو۔ (65) "

خلاصہ یہ کہ انسانی عقل و شعور کو چھٹی دے کر قرآن کے سامنے ایک جاہل مطلق کی حیثیت سے بیٹھنا کسی صورت جائز نہیں ہے۔ یہاں افراط و تفریط، دونوں سے بچنا ضروری ہے۔ یہ درست ہے کہ دوسروں کے قلم و بیان کو قرآن پر نہیں ٹھونسا جا سکتا، لیکن انسان کی فکری میراث، اُس کے قرآن کریم سے مفاہیم کو اخذ کرنے کی ظرفیت کو بڑھا دیتی ہے۔ سائنسی اور بشری علوم کے سائے میں مذکورہ معنی میں دینی معرفت میں تحول اور تبدیلی کا دعویٰ درست اور قابل قبول ہے۔ لیکن یہ دعویٰ کہ بشری علوم کا ہر جدید انکشاف، قرآنی آیات سے فہم میں تبدیلی کا پیش خیمہ بن جاتا ہے، قابلِ قبول نہیں ہے۔

* * * * *

## حوالہ جات


1۔ الانسان، 76: 1-2

2۔ الاسراء، 84:17

3۔ الشیخ المفید، ص245

4۔ الفرقان: 73

5۔ الکلینی، 178:8

6۔ طباطبائی، 244:15

7۔ یونس، 10: 42

8 ۔ وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ. البقرہ، 2: 171

9 ۔ المائدہ، 5: 103

10 ۔ یونس، 10: 100

11۔ الانفال، 8: 20-22

12 ۔ أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا. البقرہ، 2: 44

13۔ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۔۔۔ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ. ایضاً، 2: 164

14۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ. النحل، 16: 12

15۔ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ۔ آل عمران، 3 / 118؛ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ. الشعراء، 26:28

16۔ غافر، 40: 54

17۔ آل عمران، 3: 190

18۔ یوسف، 12: 111

19 ۔ الفجر، 89: 5

20 ۔ آل عمران، 3: 65

21 ۔ یونس، 10: 16

22 ۔ ایضاً، 10: 62

23۔ الشیخ الصدوق، من لایحضرہ الفقیہ، 4:369

24۔ ایضاً؛ 1:25-26

25۔ ایضاً؛ 8:20

26 ۔ النیسابوری، 2:30

27۔ نہج البلاغہ، 1:24

28 ۔ محمد الریشھری، ص 53

29 ۔ الشیخ الصدوق، الامالی، ص 312

30۔ الکلینی، 1:10

31 ۔ ایضاً، 1:16

32۔ ایضاً، 1:29

33۔ ایضاً، 23:1

34 ۔ المجلسی، 105:1

35 ۔ التفکیر فریضۃ اسلامیۃ، عباس محمود العقاد: صفحہ 1؛ بنقل از: رفیق منزل، قرآن مجید میں عقل کی نشو ونما کا انتظام، آخری مشاہدہ، 21-06-2019، ویب سائیٹ: https://rafeeqemanzil.

36 ۔ فراہی، حجج القرآن ص 198 و ص 288؛ بنقل از: ایضاً

37۔ البقرہ، 2:73 و 242؛ الانعام، 6: 151؛ غافر، 40: 67؛ الحدید، 57:17؛ النور، 24:61؛ الزخرف، 43:3؛ یوسف، 2:12

38 ۔ ایضاً، 2:12

39۔ البقرہ، 2:73

40۔ الحدید، 17

41۔ یوسف، 2:12

42۔ الزخرف، 3

43 ۔ البقرہ، 2: 219 و 266

44۔ ص، 38: 29

45۔ غافر، 40: 54

46۔ آل عمران، 3: 190

47۔ یوسف، 12:111

48 ۔ الواقعہ، 56: 77-79

49 ۔ المجلسی، 46:278

50 ۔ جوادی آملی، منزلت عقل در ہندسہ معرفت دینی، ص 36

51 ۔ الجوہری، 5:1769

52۔ الحرانی، ص 15

53 ۔ الزبیدی، 15: 504

54 ۔ دیکھیں: طباطبائی 1، مقالہ 3، فٹ نوٹ 1

55 ۔ مصباح یزدی، ص 98

56 ۔ النمل، 27: 13-14

57 ۔ الشیخ الصدوق، علل الشرایع، ص 98؛ مجلسی، بحار الانوار، ج 1، ص 99

58 ۔الکلینی، 10:1

59۔الاحسائی، 292:1

60۔دیکھیں: محمد حسنین؛ پی۔ایچ۔ڈی۔رسالہ باعنوان "رابطہ دینداری واخلاق" نتیجہ مباحث باب دوم۔جون 2007؛ دانشکدہ الہیات، تہران یونیورسٹی

61 ۔آمدی، عبدالواحد، حدیث 3340

62 ۔آملی، جوادی، منزلت عقل در ہندسہ معرفت دینی، ص:28-27

63 ۔آملی جوادی، سرچشمۂ اندیشہ، 1: 15

64 ۔ نہج البلاغہ، حکمت 147

65 ۔آملی، جوادی، سرچشمۂ اندیشہ، 29:1

# کتابیات


1. قرآن مجید
2. نہج البلاغہ
3. الاحسائی؛ابن ابی جمہور؛ عوالی اللئالی، تحقیق السید مرعشی النجفی، 1983ء
4. آمدی، عبدالواحد، غرر الحکم؛ مرکز النشر التابع لمکتب الاعلام الاسلامی؛ قم۔1366ء
5. جوادی آملی، عبداللہ، سرچشمۂ اندیشہ، مرکز نشر اسراء، قم۔1386 ش
6. ۔۔۔، منزلت عقل در ہندسہ معرفت دینی؛ نشر اسراء؛ قم۔1386 ش
7. الجوہری، الصحاح، چاپ چہارم، دار العلم للملایین؛ بیروت، لبنان۔1987ء
8. الحرانی، ابن شعبہ، تحف العقول؛ تصحیح و تعلیق علی اکبر الغفاری؛ موسسۃ النشر الاسلامی التابعۃ لجماعۃ المدرسین بقم المشرفہ۔ 1404 ق
9. الزبیدی، سید مرتضی، تاج العروس، تحقیق: علی شیری؛ دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت۔1994ء
10. الشیخ الصدوق، محمد بن علی، الامالی، مرکز الطباعۃ والنشر فی موسسۃ البعثۃ؛ قم۔1417 ق
11. ۔۔۔، علل الشرائع؛ منشورات المکتبۃ الحیدریہ و مطبعتھا؛ النجف الاشرف؛1966ء
12. ۔۔۔، من لایحضرہ الفقیہ، الطبعۃ الثانیہ؛ تصحیح علی اکبر الغفاری، منشورات جماعۃ المدرسین فی الحوزۃ العلمیۃ فی قم؛ بے تاریخ
13. الشیخ الکلینی، محمد بن یعقوب، الکافی؛ تصحیح علی اکبر الغفاری، دار الکتب الاسلامیہ، تہران۔1363 ش
14. الشیخ المفید، الاختصاص، تحقیق علی اکبر الغفاری، دار المفید للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت، لبنان۔1993ء
15. طباطبائی۔ محمد حسین، تفسیر المیزان، منشورات جماعۃ المدرسین فی الحوزۃ العلمیّۃ، قم؛ بے تاریخ
16. ۔۔۔، اصول فلسفہ وروش ریالزم، انتشارات صدرا، قم۔1393 ش
17. المجلسی، محمد باقر، بحار الانوار الجامعۃ لدُرر اخبار الائمۃ الاطہار، موسسۃ الوفاء، بیروت، لبنان۔1983ء
18. محمد الریشھری؛ العقل والجھل فی الکتاب والسنۃ، دار الحدیث للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت، لبنان۔2000ء
19. محمد حسنین؛ رابطہ دینداری واخلاق؛ دانشکدہ الہیات، تہران یونی ورسٹی۔2007ء
20. النیسابوری، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم؛ دار الفکر، بیروت، لبنان؛ بے تاریخ
21. مصباح یزدی، محمد تقی، فلسفہ اخلاق، تحقیق و نگارش احمد حسین شریفی، چاپ اوّل: چاپ و نشر بین الملل: تہران؛ 1381ش
22. رفیق منزل، قرآن مجید میں عقل کی نشوونما کا انتظام، آخری مشاہدہ، 21-06-2019، ویب سائیٹ:

https://rafeeqemanzil

# سورہ النور میں
# تفسیر نمونہ میں ناصر مکارم کا فقہی طرز استدلال

# Discernment of Nasir Makarim in Tafseer Namoona (In Sorah AlNoor)

**Muhammad Mudassar Shafique**

**Dr Muhammad Naheem Anwar Alzahri**

***Abstract:***

*Nasir Makarim Sherazi's tafseer is an important and educational extract in the Quranic field.Tafseer Namoona has its own relevance and rank amongst others.This tafseer concentrates on current fiqhi issues and give their solutions with strong sighns and it is also discussed social issues of the society. This tafseer has converted the difficult terms and words into easy way and elaborated Quranic verses with Hadith and old translations.This article examines the fiqhi style and qualities of Nasir Makarim Sherazi"especially study of Surah Noor" which are prominent factor of the tafseer.*

***Keywords****: Sura Noor, Makarim Sherazi, Tafseer e Namoona, Jurisprudencial, sociological, Insight.*

**کلیدی کلمات:** سورہ نور، مکارم شیرازی، تفسیر نمونہ، عمرانی، فقہی، بصیرت۔

## تعارف

ناصر مکارم شیرازی کی تفسیر قرآنی علوم کے علمی میدان میں انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ تفسیر نمونہ باقی تمام تفاسیر میں اپنے مقام کے لحاظ سے ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تفسیر جہاں مضبوط دلائل کے معاشرے کے عمرانی مسائل کا حل پیش کرتی ہے وہاں پر بہت سارے فقہی مسائل کو بھی زیر بحث لاتی ہے۔اس تفسیر کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں مشکل الفاظ اور اصطلاحات کو انتہائی آسان طریقے سے بیان کیا گیا ہے اور قرآنی آیات کو

احادیث اور قدیم تفاسیر کی روشنی میں وضاحت کی گئی ہے۔ یہ آرٹیکل ناصر مکارم شیرازی کے خصوصی طور پر سورہ نور کے مضامین کا فقہی طرز استدلال اور خصوصیات کا احاطہ کرتا ہے جو کہ اس تفسیر کا نمایاں پہلو ہے۔

دراصل، قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے جن و انس کی ہدایت کے لئے نازل فرمایا اور اس میں کسی کو شک و شبہ کرنے کی گنجائش نہیں کیونکہ دین اسلام کی اصل اساس قرآن مجید ہی ہے۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث بھی زبان وحی سے جاری ہوئی ہیں اور شریعت اسلامی میں بنیادی حیثیت کی حامل ہیں لیکن وہ قرآن کے برابر نہیں بلکہ قرآنی آیات کی تفسیر میں شمار ہوتی ہیں کیونکہ جہاں آپ ﷺ الفاظ قرآن کی تعلیم دیتے وہاں ان کے معانی و مفاہیم سے بھی صحابہ کرامؓ کو آگاہ فرمایا کرتے اور یہ معنی و مفہوم اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوا کرتا تھا، اس طرح قرآن مجید کے پہلے مفسر خود رسول اللہ ﷺ ہی ہیں۔ قرآن مجید میں آیا ہے: وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ [1] یعنی: "اور (اے رسول) آپ پر بھی ہم نے ذکر اس لئے نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو وہ باتیں کھول کر بتادیں جو ان کے لئے نازل کی گئی ہیں اور شاید وہ (ان میں) غور کریں۔"

امام ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "ہم نے یہ قرآن آپ ﷺ کی طرف نازل کیا کیونکہ آپ ﷺ اس کے معانی و مطالب کو خوب سمجھتے ہیں۔ اس کتاب کے آپ ﷺ بہت حریص ہیں اور آپ ﷺ ہی اس پر سب سے زیادہ عمل کرنے والے، افضل الخلق اور سید اولاد آدم ہیں۔ لہٰذا اس کے اجمال کی تفصیل اور اشکال کی وضاحت آپ ﷺ ہی کر سکتے ہیں"[2] آپ ﷺ جو تفسیر فرماتے وہ بھی منجانب اللہ ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں: وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ O إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ [3] یعنی: "وہ خواہش سے نہیں بولتا۔ یہ تو صرف وحی ہوتی ہے جو (اس پر) نازل کی جاتی ہے۔"

یوں رسول خدا ﷺ نے سب سے پہلے خود قرآن مجید کی تفسیر بیان فرمائی کہ جس کے سامعین آپ ﷺ کے اہل بیت (ع) اور صحابہ کرامؓ تھے۔ لہٰذا جب بھی کسی مسئلے کی وضاحت درکار ہوتی تو سبھی آپ ﷺ کی طرف ہی رجوع کرتے جس پر آپ ان کی راہنمائی فرماتے۔ اسی طرح دور صحابہؓ میں تابعینؒ، صحابہ کرامؓ سے تفسیر پوچھتے اور تبع تابعین، تابعین اور صحابہ کرام ﷺ کی احادیث سے حاصل ہونے والے علم تفسیر کو جمع کرتے اور مابعد علماء بھی اسی راہ کو اپناتے ہوئے زمانہ در زمانہ علوم تفسیر کو جمع کرتے رہے ہیں اور آج تک یہی طریقہ کار جاری ہے۔ گزشتہ چودہ صدیوں میں مختلف فکری رجحان رکھنے والے علماء جن میں محدثین، فقہاء، صوفیاء، حکماء، فلاسفہ، سائنس دان اور متکلمین شامل تھے سب نے اپنے زمانے کی ضروریات اور تقاضوں کے تحت اپنے ذوق کے مطابق اس بحر بی کراں کی طرف رجوع کیا کہ جس کے نتیجے میں مختلف موضوعاتی تفاسیر کی کثیر تعداد منظر عام

پر آ چکی ہے کہ جن میں بعض تفاسیر ایسی ہیں جو کہ عمرانی ہونے کے ساتھ ساتھ فقہی بھی ہیں یعنی ان میں قرآن مجید کی آیات کی تفسیر میں دیگر مسائل کے ساتھ فقہی احکام بھی بیان کیے گئے ہیں۔
بیسویں صدی عیسوی میں لکھی جانے والی مشہور تفاسیر میں سے ایک "تفسیر نمونہ" ہے جس کے مفسر آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی ہیں۔ اس تفسیر کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مفسر کو متعدد دینی اور عمرانی علوم کے ساتھ، فقہی امور سے بھی گہرا لگاؤ ہے۔ جہاں بھی احکامی آیات کی تفسیر بیان کرتے ہیں وہاں مسائل اور احکام کے استنباط کیے بغیر آگے نہیں جاتے اور پھر ان قرآنی آیات کے ثبوت میں بنیادی فقہی کتب اور فتاویٰ جات پیش کرتے ہیں۔
تفسیر نمونہ کے مفسر آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی ۱۹۲۴ء میں شیراز (ایران) میں پیدا ہوئے۔ آپ ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو مذہبی تھا اور فضائل نفسانی و مکارم اخلاقی میں مشہور تھا۔ آپ کے باپ محمد علی اور دادا محمد باقر کا شمار شیراز کے تاجروں میں ہوتا تھا اور وہ مذہبی آدمی تھے۔ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی نے اپنی پرائمری اور ہائی سکول کی تعلیم شیراز سے مکمل کی۔ ۱۴ سال کی عمر میں اسلامیات کی بنیادی تعلیم کا آغا باب خان مدرسہ سے کیا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم بہت جلد مکمل کی اور انٹرمیڈیٹ کے دونوں لیول آپ نے کم از کم چار سال میں مکمل کیے اور اس دوران آپ شیراز کے اسلامی مدرسہ میں پڑھاتے بھی رہے۔ آپ فرماتے ہیں: دلسوز اور محنتی استاد (آیت اللہ موحد) نے مجھے تعلیم دینے میں بہت محنت و کوشش سے کام لیا میں نے سیوطی کے آغاز سے کفایہ کے آخر تک ساری کتابیں استاد موحد کے پاس چار سال میں ختم کیں۔ یہی دروس آج حوزہ علمیہ قم میں دس سال کے عرصہ میں پڑھائے جاتے ہیں اور جب میں نے کفایہ کو ختم کیا تو میری عمر سترہ سال تھی اور وہیں شیراز ہی میں، میں نے کفایہ پر مختصر حاشیہ لگایا۔ ۱۸سال کی عمر میں حوزہ علمیہ قم میں علم معرفت اور سوشل سائنسز کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخلہ لیا اور اگلے پانچ سالوں تک وہاں کی اسلامی مجالس و محافل میں موجود رہے۔[4]

## علمی خدمات

ناصر مکارم شیرازی اپنی تحصیلات کے ساتھ ساتھ قم کی دینی درسگاہ میں نئے آنے والے اسکالرز کو مختلف میدانوں میں پڑھانے اور رہنمائی کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے اور آپ نے کئی تعلیمی و تربیتی پروجیکٹ شروع کر رکھے تھے جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:
1۔ **علمی تحقیقی مجلّہ کی اشاعت:** آپ نے حوزہ علمیہ قم میں دینی اسکالرز کے گروپس بنائے اور ان کی علمی و معنوی حمایت کے پیش نظر ایک میگزین (رسالہ) کی اشاعت کا اہتمام کیا جس کا نام "مکتبہ اسلام" رکھا۔ بعض منابع کے مطابق یہ مجلّہ مسلم دنیا میں پہلا رسالہ ہے کہ جس کے سب سے زیادہ خریدار رہے ہیں۔ اپنے اہداف کے مطابق

حوضۃ العلمیہ کے طالب علموں کو اس مجلّہ سے نئی راہوں کا سراغ ملا۔ اس وقت اس رسالے کو 39 سال ہو چکے ہیں اس نے مسلمانوں اور بالخصوص شیعیان جہان کے لئے بہت سی گراں قدر خدمات انجام دیں ہیں کہ جس سے جوانوں کے دلوں میں اس کا ایک خاص مقام پیدا ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ فقط دینی طالب علم بلکہ یونیورسٹیوں کے طالب علم اور اساتذہ بھی اس سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

2۔ **تقریریں اور خطاب:** آپ نے توحید اور دیگر موضوعات پر بے شمار دروس دئے ہیں۔ آپ کے بقول اس میدان (معارف اسلامی کے ضمن میں کی جانے والی تحقیقات وغیرہ) میں موجود علمی مواد اس دور کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہے کیونکہ ایک سو سال پہلے لکھی جانے والی کتابیں آج کے دور میں کماحقہ رہنمائی نہیں کرتیں۔

3۔ آپ نے محسوس کیا کہ صوفی ازم بہت زیادہ اثر ورسوخ پیدا کر چکا ہے آپ سے لوگوں نے اس بارے میں ایک ایسی کتاب لکھنے کو کہا کہ جس میں ایسے اصولوں کا ذکر ہو جو کہ صوفیانہ عقاید کی وضاحت کرنے والے اور تصوف حامیوں کی شناخت کے لئے مددگار ہوں۔

4۔ **تالیفات و تحقیقات:** ویسے تو آپ کی تمام کتابیں آپ کے فن تحریر کی عکاس ہیں لیکن آپ نے 1953ء میں؛ یہ وہ زمانہ ہے جب آپ جوان تھے، ایک ایسی کتاب شائع کی جس کا نام "جلوہ حق" تھا اس کتاب نے آیت اللہ العظمی بروجردی کی توجہ حاصل کی۔ انہوں نے اس محنت پر آپ کو ملنے کی خواہش ظاہر کی اور بہت مبارک باد پیش کی اور اس کتاب پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اس کتاب کو فارغ اوقات میں مطالعہ کیا ہے اور اس میں باریک سی غلطی بھی نہیں پائی ہے لہذا انہوں نے آپ کو یہ کہتے ہوئے دعا کی کہ: اللہ آپ کو اس کا اجر دے!۔

5۔ **ادیان شناس طلبہ کی تربیت:** آپ نے طالب علموں کی ایک اور تنظیم بنائی کہ اور ان کا تخصص (speasialization) دنیا میں رائج آٹھ بڑے بڑے مذاہب پر کروایا اور خود ان کی سرپرستی کی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ ٹیم تیار ہو گئی کہ جس نے دنیا کے مختلف نکات پر دیگر ادیان کے مقابلے میں دین اسلام کی صداقت کا بول بالا کیا۔ ابھی بھی حوضۃ العلمیہ قم میں اس شعبہ کے فارغ التحصیل مختلف عنوانات پر کام کرنے میں مصروف ہیں کہ جنہیں آپ نے "جوانوں کی حفاظت کرنے والی مذہبی کونسل" کا نام دے رکھا ہے۔

6۔ **آثار:** آپ نے تقریباً 130 کتابیں لکھیں جو سب چھپ چکی ہیں جن میں سے کچھ ایسی ہیں کہ جو تیس تیس یا اس سے بھی زیادہ مرتبہ چھپ چکی ہیں جبکہ بعض دوسری دس سے زائد زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں کہ جن میں سے مشہور ترین مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ تفسیر نمونہ 2۔ پیام قرآن

3۔ رسالہ توضیح المسائل 4۔ مناسک عمرہ مفردہ[5]

اسی طرح آپ کی فقہی موضوعات پر خاص توجہ کے پیش نظر آپ نے فقہ کی کئی کتابیں لکھیں کہ جن میں بعض ایسی ہیں کہ جو کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہیں جیسے :

1۔ انوار الفقہاء　　2۔ القواعد الفقہیۃ

3۔ عروۃ الوثقی　　4۔ انوار الاصول

## تفسیر نمونہ کا مختصر تعارف

تفسیر نمونہ ۲۷ جلدوں پر مشتمل ہے اس تفسیر میں اہلسنت و اہل تشیع مفسرین کی تفاسیر سے استفادہ کیا گیا ہے۔ بعض موقعوں پر لغت کی بحث کی گئی ہے۔ اس تفسیر میں اعتدال پسندی اور خاص طور پر معاشرتی اور سماجی معاملات کے عملی پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس تفسیر میں آیت اللہ ناصر مکارم شیرازیؒ دونوں مکاتب فکر (اہلسنت و اہل تشیع) کا نقطہ نظر بیان کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ آیت اللہ شیرازیؒ مقدمہ میں اپنی تفسیر کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

۱۔ قرآن چونکہ کتاب زندگی ہے اس لئے میں نے آیات کی ادبی، عرفانی، فقہی اور سماجی موضوعات کی تفسیر کو زندگی کے مادی، معنوی اور معاشرتی پہلوؤں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے تعمیر نو کرنے والے اجتماعی مسائل کی طرف توجہ دلوائی ہے۔

۲۔ آیات میں بیان کیے گئے عنوانات کو ہر آیت کے ذیل میں جچی تلی اور مستقل بحث کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جیسے : سود، غلامی، عورتوں کے حقوق، حج کا فلسفہ، قمار بازی کی حرمت کے اسرار، شراب، سؤر کا گوشت، جہاد اسلام کے ارکان واہداف وغیرہ جیسے موضوعات پر بحث کی گئی ہے تاکہ قارئین کو اس ایک اجمالی مطالعہ کے لئے دوسری کتب کی طرف رجوع نہ کرنا پڑے۔

۳۔ کوشش کی گئی ہے کہ آیات کے ذیل میں ترجمہ رواں، سلیس لیکن گہرا اور اپنی نوع کے لحاظ سے پر کشش اور قابل فہم ہو۔

۴۔ لاحاصل ادبی بحثوں میں پڑنے کی بجائے اصل لغوی معانی اور آیات کے شان نزول کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ کیونکہ قرآن کے دقیق معانی سمجھنے کے لئے یہ دونوں چیزیں زیادہ بہتر ہیں۔

۵۔ مختلف اشکلات، اعتراضات اور سوالات جو بعض اوقات اسلام کے اصول وفروع کے بارے میں کیے جاتے ہیں ہر آیت کی مناسبت سے ان کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے جچے تلے مختصر جواب دے گئے ہیں۔ پیامبر اسلام (ص) کی معراج، تعداد ازواج، عورت اور مرد کی میراث کا فرق، عورت اور مرد کے خون بہا میں اختلاف، قرآن کے

حروف مقطعات، احکام کی منسوخی، اسلامی جنگیں اور غزوات، مختلف الٰہی آزمائشیں اور ایسے ہی بیسیوں سوالوں کے جوابات جن میں کوئی استفہامی علامت باقی نہ رہے وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔

۶۔ ایسی تمام پیچیدہ و علمی اصطلاحات سے دوری اختیار کی گئی ہے کہ جن کے نتیجے میں کتاب ایک خاص صنف سے مخصوص ہو جائے۔ البتہ ضروری مقامات پر علمی اصطلاحات کے ذکر کے بعد ان کی واضح تفسیر و تشریح کردی گئی ہے۔[6]

۷۔ اس تفسیر نے بھی تفسیر المیزان کی طرح ایک اہم قدم اٹھایا ہے کہ جن میں بہت سے جدید سماجی، سیاسی، اخلاقی اور فقہی نکات کو بیان کیا گیا ہے۔ حق بات یہ ہے کہ اس نے عصر حاضر میں اس میدان میں پایا جانے والا خلا پر کرتے ہوئے یہ ثابت کر دیا ہے کہ قرآن ہر نسل اور ہر عصر کے لئے ہدایت اور شفاء کی کتاب ہے۔[7] ذیل میں تفسیر نمونہ کی بعض خصوصیات کو قلمبند کیا جاتا ہے:

## ۱۔ قرآن مجید کے الفاظ کی لغوی بحث

مفسر قرآن کے لئے ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ عربی لغت پر مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ عربی الفاظ اور جملات کو گرائمر کی تمام تر نزاکتوں ساتھ سمجھتا اور ان سے ان کے اصلی معانی اور مفاہیم کو اخذ کر سکتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی ایسے الفاظ جو لغوی طور پر اجنبیت کے حامل یا وضاحت طلب ہوں تو مفسرین وہاں ان کی لغوی بحث ضرور کرتے ہیں اور ان الفاظ کے معانی کھول کر آسان الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں جس سے قاری کے لئے مفاہیم قرآن کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ انہی اصولوں کے پیش نظر مفسر تفسیر نمونہ نے جہاں جہاں کوئی ایسا لفظ آیا ہے جو لغوی طور پر پیچیدہ یا وضاحت طلب تھا وہاں پر اس کی صرفی نحوی اور لغوی بحث ضرور کی ہے کہ جس کا ایک نمونہ ذیل میں قابل ملاحظہ ہے: إِنَّ الَّذِينَ جَاؤُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ[8] ترجمہ: "جو لوگ بہتان باندھ لائے وہ یقیناً تمہارا ہی ایک دھڑا ہے۔"

اس آیت کے ذیل میں آیت اللہ مکارم لکھتے ہیں کہ لفظ "افك". بر وزن فکر بقول راغب اصفہانی ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کی اصلی و طبعی حالت بدل جائے۔ مثلاً اپنے اصلی راستے سے ہٹ جانے والی مخالف ہواؤں کو **مئو تفكة** کہتے ہیں۔ بعد ازاں حق سے منحرف اور خلاف واقعہ ہر گفتگو کے لئے یہ لفظ استعمال ہونے لگا۔ اس لحاظ سے جھوٹ، تہمت اور بہتان کو بھی " افك" کہا جاتا ہے وغیرہ۔[9] مفسر تفسیر نمونہ لفظ عُصْبَةٌ کی وضاحت کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ یہ لفظ دراصل عصب کے مادے سے ان خاص ریشوں اور رگوں کے معنوں میں ہے کہ جو انسانی اعضاء کو آپس

میں جوڑتے ہیں مجموعی طور پر ان کو اعصاب کہتے ہیں۔ بعد ازاں یہ لفظ اس گروہ اور جمیعت کے معنی میں استعمال ہونے لگا کہ جس کے افراد باہم متحد و مربوط ہوں، آپس میں ہم فکر ہوں اور ہم کار بھی۔[10]

مفسر کہیں کہیں لغات کی کتب کے حوالے بھی دیتے ہیں جیسا کہ اوپر بیان کردہ لفظ افك کی بحث میں موجود ہے۔ لیکن جدید تحقیقی اصول کے مطابق مکمل حوالہ بیان نہیں کرتے، جس سے اگرچہ عوام کو شاید تفسیر میں کچھ کمی نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں یہ بات مفسر کی روش تحقیق کے جدید ترین اصولوں سے آگاہی، صحیح فٹ نوٹ دینے سے آگاہی و واقفیت کی علامت ہے۔

## ۲۔ قرآنی آیات کے فہم کے لئے احادیث کا استعمال

بحیثیت مسلمان اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن و حدیث دین اسلام کے بنیادی مآخذ میں سے ہیں اور حدیث کی ضرورت و اہمیت کا انکار اس لیے بھی ممکن نہیں ہے کہ قرآن میں موجود کئی ایسے مقامات ہیں جہاں حدیث نبوی قرآن میں دیئے گئے الفاظ کے کئی معانی میں سے کسی خاص کی تخصیص کرتی ہے۔

جیسا کہ قرآن میں ہے:

فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ حَتَّىٰ تَنكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ[11]

ترجمہ: "اگر (تیسری بار) پھر طلاق دے دی تو وہ عورت اس کے لئے اس وقت تک حلال نہ ہو گی جب تک کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کر لے۔"

عربی زبان میں نکاح کا لفظ کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس آیت میں نکاح سے مراد جنسی تعلق ہے۔ اس قسم کے ایک واقعے میں رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت سے فرمایا: حتی تذوقی عسیلتہ۔[12]

یعنی: "یہاں تک کہ تو اس (دوسرے شوہر) کا شہد نہ چکھ لے (پہلا شوہر تجھ پر حلال نہ ہو گا)"

حدیث کی اسی اہمیت کو مدّ نظر رکھتے ہوئے تمام مفسرین کی طرح آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی نے بھی اپنی تفسیر میں آیات کے دلائل کو احادیث نبوی کے ساتھ مزین کیا ہے جیسا کہ حد قذف کے احکامات نازل ہونے کے بعد کچھ صحابہ کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ کسی پر تہمت لگانے اور ثبوت نہ لانے پر اس کی سزا تو واضح ہو گئی لیکن اگر کوئی مرد اپنی بیوی کو اس حالت میں پائے تو کیا چار گواہوں کی تلاش میں نکلے گا؟ اس سوال کے جواب میں آیات لعان[13] نازل ہوئیں۔

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُن لَّهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ إِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ○ وَالْخَامِسَةُ أَنَّ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَيْهِ إِن كَانَ مِنَ الْكَاذِبِينَ○ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ أَنْ تَشْهَدَ أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ إِنَّهُ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ○ وَالْخَامِسَةَ أَنَّ غَضَبَ اللَّهِ عَلَيْهَا إِن كَانَ مِنَ الصَّادِقِينَ[14]

ترجمہ: ''اور جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کی تہمت لگائیں اور ان کے پاس خود ان کے سوا کوئی گواہ نہ ہو تو ان میں سے ایک شخص کی شہادت یہ ہے کہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ وہ سچا ہے۔اور پانچویں بار کہے کہ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔اور عورت سے سزا اس صورت میں ٹل سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ یہ شخص جھوٹا ہے۔ اور پانچویں مرتبہ کہے کہ مجھ پر اللہ کا غضب ہو اگر وہ سچا ہے۔''

موصوف نے تفسیر نور الثقلین اور فی ظلال القرآن میں موجود وہ مکمل حدیث جس میں سوال اور پھر لعان کی عملی شکل موجود ہے نقل کی ہے۔ جو کہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی ''الذین یرمون ازواجھم'' حضرت سعد نے کہا یارسول اللہ ﷺ میں جانتا ہوں کہ یہ آیت برحق ہے اور اللہ کی طرف سے ہے۔ لیکن مجھے اس پر تعجب ہے کہ اگر میں کسی شخص کو اس حال میں پاؤں کہ میری بیوی کی رانیں کسی شخص پر ہوں تو میرے لئے یہ ممکن نہیں ہوگا کہ میں ان کو باز رکھنے کے لئے چار گواہ پیش کروں۔ پس نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے انصار تم نے نہیں سنا کہ تمہارے سردار نے کیا کہا؟ انہوں نے کہا یارسول اللہ ﷺ اس کو ملامت نہ کریں اس سے بڑھ کر ہم میں کوئی غیرت مند نہیں ہے۔اس نے جب بھی نکاح کیا کنواری لڑکی سے کیا اور اس نے اپنی جس بیوی کو طلاق دی تو کسی نے اس سے نکاح کی خواہش نہیں کی۔ [15]

حضرت سعد بن عبادہؓ نے کہا یارسول اللہ ﷺ کیا یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں اس کو اتنے گواہ پیش کرنا ہوں گے جن کا اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ذکر فرمایا ہے۔ پھر ان کے عم زاد، بلال بن امیہ اس سانحہ میں مبتلا ہوگئے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو خبر دی کہ انہوں نے اپنی بیوی کے ساتھ ایک مرد کو پایا ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے سورۃ نور کی یہ آیت نازل فرمائیں۔جب مرد نے اپنی بیوی کے خلاف چار مرتبہ شہادت دے دی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا رک جاؤ یہ شہادت تم پر واجب ہے۔ پھر اس سے فرمایا اگر جھوٹے ہو تو توبہ کرلو اس نے کہا اللہ کی قسم میں سچا ہوں۔ پھر اس نے پانچویں قسم بھی کھالی۔ پھر اس کی بیوی نے اللہ کی قسم کھا کر چار مرتبہ گواہی دی کہ اس کا خاوند جھوٹا ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا رک جاؤ یہ شہادت واجب ہے پھر اس سے فرمایا اگر تم جھوٹی ہو تو توبہ کرلو وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا

میں تمام دن اپنی قوم کو رسوا نہیں کروں گی پھر اس نے پانچویں بار قسم بھی کھالی۔ پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر اس کا ایسا بچہ ہوا تو وہ فلاں کا ہے۔ پھر اس کے ہاں ویسا ہی بچہ پیدا ہوگیا۔ یہ حدیث مسند احمد اور مجمع الزوائد، حدیث کی کتب میں موجود ہیں۔[16]

## ۳۔ احادیث کا واضح ثبوت اور اس سے استدلال

آیت اللہ مکارم شیرازی آیات کی تفسیر کے دوران جب بھی مسائل اخذ کرتے ہیں تو ان مسائل یا گفتگو کا انحصار کسی تخیلاتی یا ذہنی اختراع پر نہیں ہوتا بلکہ ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ آیت سے متعلقہ مسائل کے لئے وہ حدیث نبوی ﷺ سے استدلال کرتے نظر آتے ہیں۔ جیساکہ استیذان[17] کی گفتگو میں اسلام کے حکیمانہ آداب کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی ابو سعید نے آپ کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت چاہی اور دروازے کے بالکل سامنے کھڑے ہوگئے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اجازت لیتے وقت دروازے کے سامنے کھڑے مت ہوا کرو۔[18] مزید بیان کرتے ہیں کہ روایات میں یہاں تک حکم دیا گیا ہے کہ جب کوئی اپنے ماں باپ کے گھر یا بیٹے کے گھر بھی جانا چاہے تو پہلے اجازت لے۔ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ جب میں اپنی ماں کے گھر جانے لگوں تو کیا وہاں بھی اجازت لوں؟ فرمایا: اتحب ان تراها عريانة کیا تو پسند کرتا ہے کہ اپنی ماں کو برہنہ دیکھے۔ اس نے عرض کی، نہیں۔ پھر فرمایا: فاستاذن عليها[19] اسی طرح تین بار اجازت لینے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بعض روایات میں یہاں تک ہے کہ تین مرتبہ اجازت لینی چاہیے۔

۱۔ پہلی مرتبہ اس طرح سے کہ گھر والے سن لیں۔

۲۔ دوسری دفعہ وہ اپنے آپ کو آمادہ کرلیں۔

۳۔ پھر تیسری مرتبہ اجازت طلب کی جائے۔ گھر والے چاہیں تو اجازت دیں اور چاہیں تو نہ دیں۔[20]

## ۴۔ اہل بیت عظام سے استدلال

سورہ نور کی آیت: وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ[21] ترجمہ: "اور تم میں سے جو لوگ بے نکاح ہوں اور تمہارے غلاموں اور کنیزوں میں سے جو صالح ہوں ان کے نکاح کردو۔" کی تفسیر میں آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی اولیاء کو غیر منکوحہ عورتوں اور مردوں کے نکاح کی ترغیب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں کہ شادی ایک اختیاری عمل ہے جس کا تعلق زوجین کی رضامندی سے وابستہ ہے اور اولیاء کو اس بات کی ترغیب دی جارہی ہے کہ نکاح کے معاملے میں راہوں کو ہموار کرو، مالی امداد کی صورتیں پیدا کرو، مناسب رشتوں کی

تلاش میں مدد کرکے اس نیک اور سنت عمل میں آپس میں تعاون کی راہیں ہموار کرکے اللہ اور اس کے رسول کے ہاں سرخرو ہونے کی کوشش کرو۔ ویسے بھی تعاون فی الخیر ہمیشہ منشاء الٰہی ہے۔ تو نکاح جیسے عمل میں تو اس کی اہمیت کئی گنا زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس تعاون کی ترغیب کے لئے آیت اللہ ناصر مکارم نے حضرت مولا علیؑ کا فرمان بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: افضل الشفاعات ان تشفع بین اثنین فی نکاح حتی یجمع اللہ بینھما[22] یعنی: "بہترین تعاون یہ ہے کہ دو افراد کے درمیان شادی کے لئے ملاپ کروائے یہاں تک کہ معاملہ تکمیل تک پہنچ جائے۔"

اسی طرح پردے کے احکامات میں مسلم عورتوں کا غیر مسلم عورتوں کے سامنے بے پردہ آنے کے احکامات میں لفظ نِسَائِهِنَّ[23] کے حوالے سے حضرت جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ: لاینبغی للمراۃ ان تنکشف بین یدی الیھودیہ والنصرانیۃ، فانھن یقلن ذلك لازواجھن[24] یعنی: "مناسب نہیں ہے کہ مسلمان عورت کسی یہودی یا عیسائی عورت کے سامنے عریاں ہو کیونکہ جو کچھ وہ دیکھیں گی اپنے شوہر سے بیان کریں گی۔"

## ۵۔ فقہی مسائل میں آئمہ اہل بیتؑ و فقہاء سے استدلال:

فقہی مسائل میں مفسر کا مؤقف انتہائی معتدل اور دین کی حقیقی روح سے مطابقت رکھتا ہے۔ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی اپنی تفسیر میں آئمہ اہل بیت کی آراء سے نہ صرف استفادہ کرتے ہیں بلکہ ان کی آراء اور اقوال کو بہت اہمیت دی ہے جیسا کہ

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ[25]

ترجمہ: "اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں پھر اس پر چار گواہ نہ لائیں پس انہیں اسّی (80) کوڑے مارو اور ان کی گواہی ہرگز قبول نہ کرو اور یہی فاسق لوگ ہیں۔"

اس آیت میں تہمت لگانے والے کی گواہی کو قبول نہ کرنے اور فسق و فجور کا جو حکم دیا گیا ہے اور بعد میں آنے والی آیت: إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ[26]

ترجمہ: "سوائے ان لوگوں کے جو اس کے بعد توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں، اس صورت میں اللہ بڑا معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔"

جس میں توبہ اور اصلاح کا پہلو موجود ہے کی تفسیر بیان کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں مفسرین اور علماء کی آراء میں اختلاف ہے۔ یہ استثناء اگر دونوں جملوں کی طرف لوٹے تو ان کی توبہ بھی مقبول ہوگی اور ہر لحاظ سے فسق بھی اٹھا

لیا جائے گا لیکن اگر یہ استثناء صرف آخری جملے کی طرف لوٹے تو اب وہ فاسق شمار تو نہیں ہوگا لیکن ان کی گواہی آخری عمر تک قبول نہیں ہوگی۔ فقہ کے اصول قواعد کے مطابق استثناء دو یا چند جملوں کے بعد آئے اس کا تعلق صرف آخری جملے سے ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس آیت میں دوسری قسم کے قرائن بھی موجود ہیں۔ اگر توبہ کے ذریعے فسق کا حکم اٹھ جائے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ گواہی قابل قبول نہ رہے۔ کیونکہ شہادت کی عدم قبولیت فسق کی وجہ سے تھی اب جس شخص نے توبہ کرلی ہے اور نئے سرے سے اس نے ملکہ عدالت حاصل کرلیا ہے تو فسق اس سے دور ہوگیا۔ شیرازی صاحب اس کی تائید میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت نقل کرتے ہیں جو مندرجہ بالا مفہوم پر زور دیتی ہے۔

امام صادق علیہ السلام سوال کرنے والے شخص سے ان افراد کی شہادت کے قبولیت کے بارے میں پوچھتے ہیں جو فقہاء تمہارے قریب رہتے ہیں وہ کیا کہتے ہیں؟ اس نے عرض کی وہ کہتے ہیں ان کی توبہ اللہ اور اس کے درمیان تو قبول ہوگئی لیکن ان کی شہادت ہمیشہ کے لئے ناقابل قبول ہے۔

امامؑ فرماتے ہیں: بئس ما قالو کان ابی یقول اذا تاب ولم یعلم منه الا خیر جازت شهادة[27]

یعنی: "انہوں نے بری بات کہی ہے میرے والد فرمایا کرتے تھے جو شخص توبہ کرے اور پھر اس سے خیر اور اچھائی کے سوا کچھ نہ دیکھا جائے تو اس کی شہادت قبول ہے۔"

## ۶۔ فقہی بصیرت

آیت اللہ صاحب کا فقہی احکام سے کافی لگاؤ نظر آتا ہے جہاں جہاں احکامی آیات کی تفسیر کرتے ہیں ان میں سب سے پہلے قرآن کی تفسیر قرآن سے اور پھر ان کی تفسیر حدیث کے استدلال سے بھرپور ہے اور اس کے بعد قدیم مفسرین اور فقہاء کی آراء کا بھرپور استعمال لاتے ہیں اور آخر پر ان آیات سے متعلقہ فقہی احکام بیان کرتے ہیں جو کہ ان کی فقہی بصیرت اور قوت استدلالی کا واضح ثبوت ہے۔ خاص طور پر دور جدید میں پیدا ہونے والے کچھ احکام کا تفصیلی نوٹ بیان کرتے ہیں۔

حد زنا کے معاملات بیان کرتے ہوئے زانی مرد اور زانی عورت کی سزا کی بابت لکھتے ہیں کہ دراصل یہ احکامات تین مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہیں:

۱۔اس سے مراد مرد اور عورت کا آپس میں جنسی ملاپ جو کہ آپس میں شادی شدہ نہیں کہ جس کے لئے کوئی شرعی جواز موجود ہو۔

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِئَةَ[28]

ترجمہ: ’’زناکار عورت اور زناکار مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔ ‘‘

۲۔ سزا کے اجراء کے لئے ہر گز ترس محل نرمی کے احساسات نہیں ہونے چاہیے۔ کیونکہ ایسا ترس اور نرمی کا نتیجہ معاشرے کی آلودگی اور ترویج گناہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ایسے احساسات کو ختم کرنے کے لئے اللہ اور روز جزا پر ایمان کا ذکر کیا ہے۔

وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ[29]

ترجمہ: ’’اور دین خدا کے معاملے میں تمہیں ان پر ترس نہیں آنا چاہیئے اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔‘‘

۳۔ تیسرا حکم یہ ہے کہ حد جاری کرتے وقت کچھ لوگ موجود ہوں کیونکہ اس سزا کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ گنہگار کو عبرت حاصل ہو بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس کی سزا دوسروں کے لئے بھی باعث عبرت ہو۔

وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ[30]

ترجمہ: ’’اور ان کی سزا کے وقت مومنین کی ایک جماعت موجود رہے۔‘‘

ان احکامات کے پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے مفسر معاشرے کے استحکام، مضبوطی اور تشکیل و بناوٹ کے لحاظ سے گفتگو کرتے ہیں کہ اخلاقی برائیاں صرف ایک شخص میں ہی موجود نہیں رہتیں بلکہ معاشرے کی طرف بھی سرایت کرتی ہیں لہٰذا معاشرے کی تطہیر کے لئے ضروری ہے کہ جس طرح گناہ برملا ہوا ہے سزا بھی برملا ہو اور اس سوال کا جواب بھی دیتے نظر آتے ہیں کہ اسلام ایک شخص کی عزت دوسروں کے سامنے برباد ہونے کی اجازت کیوں دیتا ہے؟ کیونکہ جب تک گناہ واضح نہ ہو اور مسئلہ اسلامی عدالت تک نہ پہنچے تو اللہ، جو ستار العیوب ہے اس پردہ پوشی پر راضی نہیں ہے لیکن جرم ثابت ہو جانے پر، راز کھل جانے پر، معاشرے کے آلودہ ہو جانے پر اور گناہ کو معمولی سمجھے جانے کے بعد سزا اسی صورت میں ملنی چاہیے کہ گناہ کے منفی اثرات مٹ جائیں اور گناہ کی بڑائی کا احساس اسی طرح لوٹ آئے۔[31]

اسی طرح سے یہاں پر اٹھنے والا ایک اور سوال یہ بھی ہے کہ زانی مرد و عورت کی شادی صرف زانی مرد و عورت سے ہی ہونی چاہیے۔

الزَّانِي لَا يَنكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً وَالزَّانِيَةُ لَا يَنكِحُهَا إِلَّا زَانٍ[32]

ترجمہ: ’’زانی صرف زانیہ یا مشرکہ سے نکاح کرے گا اور زانیہ صرف زانی یا مشرک سے نکاح کرے گی۔‘‘ کے جواب میں آیت اللہ مکارم لکھتے ہیں کہ اس سلسلہ میں مفسرین کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ آیت ایک حکم الٰہی

پیش کرتی ہے یا ایک خارجی معاملے کی خبر ہے۔ لکھتے ہیں کہ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیت صرف ایک عینی حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ آلودہ افراد ہمیشہ ناپاک افراد کے پیچھے ہی جاتے ہیں، "کند هم جنس باهم جنس پرواز" لیکن باایمان اور پاکیزہ افراد ہر گز آلودہ دامن اور ناپاک افراد کو جیون ساتھی بنانے کو تیار نہیں ہوتے اور انہیں اپنے اوپر حرام قرار دیتے ہیں۔[33]

**۷۔ فقہی جزئیات کا احاطہ**

آیت اللہ مکارم احکام کے بیان میں کلیات اور جزئیات دونوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ کلیات میں درجہ بدرجہ جزئیات کو درج کرتے چلے جاتے ہیں جن میں سے چند مضامین درج ذیل ہیں۔

زنا، قذف، واقعہ افک، لعان، نکاح، غض بصر، استیذان کے احکامات، آیت استخلاف کی حقیقت، اطاعت الٰہیہ اور اطاعت رسول ﷺ۔ ان کلی احکام میں سے ہر ایک کے تحت اس کے جزئیات درج کرتے چلے جاتے ہیں۔ جیسا کہ نکاح کی کلی بحث میں جہاں اس کی اہمیت کی گفتگو کرتے ہیں اور نکاح کرنے والوں کے لئے ترغیب اور بشارت جب کہ نہ کرنے والوں کے لئے وعید کی ابحاث لاتے ہیں جیسا کہ

تناکحو تناسلو تکثرو فانی اباهی بکم الامم یوم القیامة ولو بالسقط[34]

یعنی: "شادی کرو تا کہ تمہاری نسل بڑھے کیونکہ روز قیامت میں تمہاری تعداد کی کثرت پر فخر کروں گا یہاں تک کہ سقط شدہ بچوں پر بھی۔"

اور اسی طرح جو اس سنت سے انحراف کرتا ہے اس کے لئے وعید کا ذکر بھی ہے۔

شرار کم وعزابکم[35] یعنی: "تم میں بدترین افراد غیر شادی شدہ اور مجرد ہیں۔"

اس بحث میں جزئیات کے طور پر ان اولیاء پر بھی مفصل گفتگو کرتے ہوئے نہ صرف ان کو اس بات کا ادراک کروانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بالغ لڑکے اور لڑکیوں کے نکاح میں مدد کرو بلکہ والدین کو احساس ذمہ داری اور کسی قسم کے سرزد ہونے والے گناہ میں برابر کا حصہ دار ہونے کی وعید دیتے ہوئے احساس پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو باپ اس اہم مسئلہ کی پرواہ نہیں کرتے انہیں اولاد کی کج روی کے جرم میں شریک شمار کیا ہے اور اس بابت نبی اکرم ﷺ کی حدیث بیان کرتے ہیں:

من ادرك له ولد وعنده مایزوجه فلم یزوجه، فاحدث فالاثم بینهما[36]

یعنی: "جس کا بچہ بالغ ہو جائے اور وہ اس کی شادی کے وسائل رکھتا ہو اور پھر بھی اس کے لئے اقدام نہ کرے اور اس کا بچہ کسی گناہ کا مرتکب ہو جائے تو یہ گناہ دونوں کا لکھا جائے گا۔"

مزید جزئیات کو زیر بحث لاتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ شادی کے اخراجات سادہ اور آسان ہونا چاہیں، وہ حق مہر کی صورت میں ہوں یا کسی اور صورت میں تاکہ اخراجات شادی کی راہ میں حائل نہ ہوں عموماً حق مہر کا مسئلہ کم آمدنی والے افراد کی شادی کے راستے میں حائل ہو جاتا ہے اس سلسلے میں نبی اکرم ﷺ کا فرمان نقل کرتے ہیں: شوم المرئة غلاء مهرها [37] یعنی: "منحوس اور بد بخت ہے وہ عورت جس کا حق مہر بھاری ہو۔"

(اس لئے کہ تفسیر نمونہ کے مفسر ایرانی النسل ہیں ہو سکتا ہے کہ ایران میں شادیوں کی تاخیر کا ایک سبب حق مہر ہو لیکن ہمارے ہاں پاکستان اور ہندوستان میں شادیوں کی تاخیر جہیز کی غیر شرعی رسم اور معاشرتی لعنت کی وجہ سے تو ہے لیکن حق مہر کی وجہ سے کم دیکھنے میں آتی ہے) اسی طرح آیت اللہ مکارم شیرازی مزید نکاح کی بحث میں شادی کرنے، غربت کی وجہ سے شادی نہ کرنے، روزی کے معاملات بیوی اور بچوں کے ساتھ بڑھنے کے عوامل کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔

## ۸۔احکام کے سماجی مضمرات کا تذکرہ

موصوف بعض آیات جن سے احکام مستنبط ہوتے ہیں وہاں جزوی اور فروعی احکام بیان کرنے کی بجائے بڑی جامعیت سے ان کے ہمہ گیر معاشرتی و سماجی اثرات و مضمرات پر گفتگو کرتے ہیں جیسا کہ پردہ کی گفتگو میں بیان کرتے ہیں کہ عریانی میں اضافے کی وجہ سے دنیا میں طلاق اور ازدواجی زندگی میں علیحدگی کا تناسب بڑھتا جا رہا ہے چونکہ جو آنکھ دیکھے گی دل اسے یاد رکھتا ہے۔ فحاشی کا پھیلاو ناجائز اور اولاد کی کثرت بے پردگی کے دردناک ترین نتائج میں سے ہیں، مفسر کے نزدیک ایسے اعمال کے نتائج کے اعداد و شمار مشرق کی بجائے مغرب میں زیادہ ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق انگلستان میں ہر سال پانچ لاکھ ناجائز بچے پیدا ہوتے ہیں انگلستان کے محققین اور دانشوروں نے اس سلسلے میں ملک کے ارباب بسط و کشاد کو اس سنگین مسئلے سے آگاہ کیا ہے۔ ان دانشوروں کے مطابق اخلاقی و مذہبی لحاظ سے نہیں بلکہ اس ناجائز اولاد کا وجود معاشرے کے امن و امان کے لئے خطرہ بن چکا ہے یہاں تک کہ جرائم کی فائلوں میں انہی کا نام عمومی طور پر پایا جاتا ہے۔ مفسر موصوف مزید بے پردگی اور عریانی کو عورت کے زوال کا سبب قرار دیتے ہیں۔ اگر معاشرہ عورت کو عریاں بدن دیکھنا چاہے گا تو فطری بات ہے کہ ہر روز اس سے آرائش کا تقاضا بڑھتا جائے گا اور اس کی نمائش میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ عورت کشش کی بناء پر تشہیر کا ذریعہ بن جائے گی۔ انتظار گاہوں میں بلاوے اور سیاحوں کو متوجہ کرنے کا ذریعہ ہو گی۔ اس کی حیثیت معاشرے میں کھلونے یا بے قیمت مال سے بھی گر جائے گی۔ ایسے معاشرے میں عورت اپنی اخلاقی خصوصیات، علم و آگہی اور بصیرت کے مظاہرے کیسے کر سکتی ہے اور بلند مقام کیسے حاصل کر سکتی ہے؟[38] آیت اللہ صاحب کی تفسیر فقہی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ سماجی اور معاشرتی عوامل پر سیر حاصل بحث کرتی ہے اور مفسر

آیت کے ہر عمرانی پہلو کو ضرور زیر بحث لاتے ہیں ان کی مثالیں زنا اور اس کے سماجی معاملات، حد قذف، لعان اور غض بصر جیسے مضامین کی تفسیر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

## ۹۔ معترضین کے اعتراضات کا جواب

آیت اللہ صاحب ان اعتراضات کا بھی جواب دیتے ہیں۔ جو امت میں پائے جانے والے مختلف گروہوں کی طرف سے اٹھائے جاتے ہیں یا وہ اعتراضات اور سوالات جو گروہوں کے درمیان اختلافی نوعیت کے ہیں ان کے جوابات کافی وضاحت اور استدلال سے حل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَعَدَ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ[39]

ترجمہ: ''تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور نیک اعمال بجا لائے ہیں اللہ نے ان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ انہیں زمین میں اس طرح جانشین ضرور بنائے گا جس طرح ان سے پہلوں کو جانشین بنایا اور جس دین کو اللہ نے ان کے لئے پسندیدہ بنایا ہے اسے پائدار ضرور بنائے گا اور انہیں خوف کے بعد امن ضرور فراہم کرے گا، وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں اور اس کے بعد بھی جو لوگ کفر اختیار کریں گے پس وہی فاسق ہیں۔''

مندرجہ بالا آیت سے احکامات کا استدلال کرنے میں مفسرین اہلسنت و اہل تشیع میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اہلسنت کے نزدیک اس آیت کا مصداق خلفاء اربعہ ہیں جب کہ اہل تشیع امام مہدیؑ کی آمد اور ان کے دور کو اس کا مصداق قرار دیتے ہیں۔ آیت اللہ ناصر مکارم نے اپنی تفسیر میں تین مختلف طبقات کے مفسرین کی آراء کا ذکر کیا ہے کہ بعض نے اسے اصحاب رسول کے ساتھ مخصوص سمجھا ہے جب کہ بعض نے خلفاء اربعہ کی حکومت کی طرف اشارہ کیا ہے اور بعض نے اسے حضرت امام مہدیؑ کی حکومت کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ عالم کے مشرق و مغرب جن کے زیر نگین ہوں گے۔ مفسر تفسیر نمونہ آخر میں بیان کردہ پہلو کے ثبوت میں دلائل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لفظ ارض مطلق ہے اور اس سے مراد ساری زمین ہے اور یہ امر منحصراً حضرت امام مہدیؑ کی حکومت سے مربوط ہے کیونکہ گزشتہ مومنین کی حکومت ساری دنیا پر محیط نہ تھی۔[40]

مزید لکھتے ہیں کہ ہر طرف امن و سکون، توحید کی حاکمیت، شرک سے پاک عبادت صرف حضرت امام مہدیؑ کے زمانے میں ہی ممکن ہو گی اور اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ سے حدیث نقل کرتے ہیں:

لولم يبق من الدنيا الا يوم لطول الله ذلك اليوم حتى يلى رجل من عترتى اسمه اسمى، يملا الارض، قسطا كما ملئت ظلما و جورا[41]

یعنی: "اگر دنیا کی زندگی کا ایک دن بھی رہ جائے گا تو اللہ اسے اتنا طویل؛ کر دے گا کہ اس میں میری عترت میں سے ایک فرد زمین پر حاکم ہو گا۔ اس کا نام میرا نام ہو گا، جیسے زمین ظلم و ستم سے بھر چکی ہو گی وہ ایسے ہی اسے عدل و انصاف سے پر کر دے گا۔"

### پردے پر اعتراضات کے جوابات

اسی طرح سے شرعی پردہ" غض بصر" "پر آج کے دور میں جدید نسل کی طرف سے اٹھائے جانے والے اعتراضات کے عقلی دلائل کی بنا پر جوابات دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ پردے نے عورتوں کو ثقافتی، معاشرتی، فکری اور تمدنی معاملات میں بہت پیچھے دھکیل دیا ہے یا یہ کہ وہ مدعی ہیں کہ پردے کی وجہ سے اکیسویں صدی میں اقتصادی دوڑ میں عورتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ایرانی حالات کے مطابق لکھتے ہیں کہ آج انقلابی دور کے بعد عورتیں ہر جگہ پردے کے ساتھ موجود ہیں، دفتروں میں، ہسپتالوں میں، سیاسی مظاہروں میں، ٹیلی ویژن، ریڈیو اور مراکز صحت میں، خصوصاً جنگ کے زخمیوں کے لئے ہر وقت نرسوں کی صورت میں موجود ہیں بلکہ یہاں تک کہ میدان ثقافت اور تعلیمی اداروں میں پردے کے ساتھ اپنا معاشرتی کردار ادا کر رہی ہیں، مزید لکھتے ہیں کہ گھر میں بھی عورتیں بیکار نہیں ہیں بلکہ گھروں میں بیٹھ کر عورتوں کا آنے والی نسل کی پرورش کرنا، انہیں آبرو مند بنا دیتا ہے، وہ معترضین سے استفسار کرتے ہیں کہ معاشرے کی تشکیل کے لئے با کردار لوگوں کو تیار کرنا، کیا یہ کوئی کام نہیں ہے؟ لوگ عورت کی اس محنت اور عظیم خدمت کو مثبت انداز میں کیوں نہیں دیکھتے؟

لبرل لوگوں کا دوسرا اعتراض یہ کہ پردہ عورت کے لئے معاشرے میں بھاگ دوڑ کر کام کرنے میں رکاوٹ ہے کیونکہ یہ انسان کے ہاتھ پاؤں کو باندھ دیتا ہے، عورت کام کرے، بچے کو سنبھالے یا پردے کی فکر کرے؟

موصوف اس کا جواب کچھ یوں دیتے ہیں کہ یہ لوگ پردے کے حقیقی معنی سے غافل ہیں۔ پردہ صرف چادر اور برقعے کا نام نہیں ہے بلکہ ایسا لباس جو آپ کے جسم کو مکمل ڈھانپ لیتا ہے اسی کو پردہ کہتے ہیں لیکن اگر چادر ہو تو یہ اس کی آئیڈیل صورت ہے البتہ یہ اس وقت ہے کہ جب یہ چادر عورت کے لئے اپنے امور کی انجام دہی میں

مانع نہ ہو۔ مزید وہ عورتیں جو کاشت اور کٹائی کا کام کرتی ہیں انہوں نے اس بات کا ثبوت دیا ہے اور اس اعتراض کا عملی جواب دیا ہے کہ پردہ ان معاملات میں رکاوٹ نہیں ڈالتا۔

اس ضمن میں تیسرا اعتراض جو کیا جاتا ہے کہ پردہ عورتوں اور مردوں کے درمیان حائل ہو کر مردوں کی حرص زیادہ بڑھا دیتا ہے اور آگ بجھنے کی بجائے بھڑک اٹھتی ہے۔

اس اعتراض کے جواب میں موصوف لکھتے ہیں کہ : اس موضوع کا عملی مشاہدہ کرنے کے لئے ہمارا ایرانی معاشرہ دیکھا جا سکتا ہے، کیونکہ بادشاہت کے دور میں ایران میں جگہ جگہ گناہ کا مراکز موجود تھے، گھرانوں کے گھرانے اور خاندانوں کے خاندان عجیب بے لگام زندگی گزار رہے تھے، طلاق معاشرے میں عام تھی اور ایسی کئی برائیوں کا بول بالا تھا، لیکن آج پردہ ہمارے معاشرے کے تمام مراکز میں موجود ہے اور ملک پہلے سے زیادہ ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ اگرچہ ہم یہ نہیں کہتے کہ انقلاب کے بعد ہر برائی جڑ سے اکھاڑ دی گئی ہے لیکن بلا شبہ ان میں کمی ضرور آئی ہے اور اس اعتبار سے امن اور سلامتی ہمارے معاشرے میں لوٹ آئی ہے اگر حالات اسی طرح بہتر رہے تو یہ مزید قباحتیں بھی ختم ہو جائیں گی اور ہمارا معاشرہ خاندانوں کی پاکیزگی اور عورت کی قدر و منزلت کے تحفظ کے لحاظ سے اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے گا۔[42]

## خلاصہ بحث

تمام گزارشات کا خلاصہ یہ ہے کہ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی تفسیر "تفسیر نمونہ" تفسیری ادب میں ایک اہم علمی مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن مجید کی آیات، احادیث نبوی ﷺ اور خاص طور پر فقہ جعفریہ کی مستند کتب سے استدلال اس تفسیر کے منہج اور خود مفسر کی علمی شخصیت کا ایک بولتا ثبوت ہے۔ انہی خصوصیات کی بنا پر اس تفسیر کو عمرانی تفاسیر کے ساتھ ساتھ، فقہی تفاسیر میں بھی ایک خصوصی مقام حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ تفسیر میں مشکل الفاظ کو آسان اور صرفی و نحوی مباحث کے ذریعے مشکل الفاظ کے لغوی اور اصطلاحی معانی کی وضاحت کی گئی ہے۔ موصوف فقہی آراء اور ان میں موجود اختلافات کو حتیٰ الامکان دلائل کے ساتھ واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن خود جعفری ہونے کی وجہ سے فقہاء جعفریہ کی آراء کو ترجیح دیتے نظر آتے ہیں اور تفسیر میں بہت سی پیچیدگیوں کی گتھیوں کو سلجھایا گیا ہے۔ آیات کا پس منظر سمجھانے کے لئے ان کے سبب نزول کی مکمل وضاحت کرتے ہیں جس سے آیت کا معنی و مفہوم مزید واضح ہو جاتا ہے۔ ذخیرہ احادیث کے علاوہ قدیم تفسیری ادب جس میں نور الثقلین، جامع البیان، المیزان، جیسے مصادر علمی سے استفادہ کیا گیا ہے اور اس تفسیر کی خوبصورتی کا وہ پہلو کہ تفسیر نمونہ میں اہلسنت کی بنیادی تفاسیر کی کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جو کہ اس تفسیر کی ایک منفرد خصوصیت ہے یوں یہ تفسیر امت مسلمہ کے لئے ایک گراں قدر سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

## حوالہ جات

1۔النحل، 16: 44

2۔ ابن کثیر، 2:992

3۔النجم، 53 :3,4

4۔ https://makarem.ir/main.aspx?lid=4&View=1&ty0peinfo; Last seen 05-08-2019.

5۔ Ibid

6۔ مکارم شیرازی، 1:36۔37

7۔ https://makarem.ir/main.aspx?Reader=1&lid=4&pid=321543&catid=6479; Last seen 05-08-2019

8۔ النور، 11:24

9۔مکارم شیرازی، 8:190

10۔ایضاً

11۔ البقرۃ، 2:230

12۔ بخاری، الحدیث، 2678

13۔علامہ سید مرتضیٰ زبیدی لکھتے ہیں کہ لعن کی نسبت اللہ کی طرف سے ہو تو اس کا معنی ہے دھتکارنا اور خیر سے دور کرنا اور جب اس کی نسبت مخلوق کی طرف ہو تو یہ کلمہ بددعا ہے۔اور لعان کا معنی یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو زناء کی تہمت لگائے تو امام اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان لعان کروائے اور مرد سے ابتداء کرائے۔ چار بار یہ کہے کہ میں اللہ کو اس بات پر گواہ بناتا ہو کہ اس نے فلاں کے ساتھ زناء کیا ہے اور میں اپنی اس تہمت میں سچا ہوں۔ پانچویں بار یہ کہے کہ اگر وہ زناء کی تہمت میں جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ پھر عورت کو کھڑا کیا جائے اور وہ چار بار یہ کہے کہ میں اللہ کو اس پر گواہ بناتی ہوں کہ اس شخص نے جو مجھ پر تہمت لگائی ہے یہ اس تہمت میں جھوٹوں میں سے ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر یہ سچوں میں سے ہو تو مجھ پر اللہ کا غضب نازل ہو۔ لعان کے بعد وہ عورت اس شخص سے بائنہ ہو جائے گی اور کبھی اس شخص کے لئے حلال نہیں ہو گی اگر وہ حاملہ ہو تو بچہ اس عورت کے ساتھ لاحق کیا جائے گا۔(زبیدی، 9: 335-334

14۔ النور، 24:6تا9

15۔ طبرسی، 7:178؛ محمد قطب شہید، 6:409؛الحویزی، 3:578

16۔احمد بن حنبل، حدیث، 2131؛الہثیمی، 5: 11,12

17۔ فقہاء کی اصطلاح میں استیذان "رکاوٹ کو توڑنا" کے معنی میں ہے۔ یعنی کسی شرعاً ممنوع چیز کے استعمال میں آزادی حاصل کرنا۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایسی جگہ یا ایسے وقت میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرنا جس کا اجازت چاہنے والا مالک نہ ہو. جرجانی، ص15

18۔ مکارم شیرازی، 190:8

19۔ الحویزی، 583:3

20۔ ایضاً: 587:3 بہ نقل از مکارم شیرازی، 217:8

21۔ النور، 32:24

22۔ عاملی، 27:14

23۔ النور، 31:24

24۔ الحویزی، 593:3

25۔ النور، 4:24

26۔ ایضاً، 5:24

27۔ عاملی، 282:18

28۔ النور، 2:24

29۔ ایضاً

30۔ ایضاً

31۔ مکارم شیرازی، 166:8

32۔ النور، 3:24

33۔ مکارم شیرازی، 167:8

34۔ قمی، 561:1,

35۔ ایضاً

36۔ طبرسی، فضل بن حسن، شیخ، مجمع البیان، درج ذیل آیت کے ذیل میں

37۔ عاملی، 10:15

38۔ مکارم شیرازی، 227:8

39۔ النور، 24 :55

40۔ مکارم شیرازی، 293:8

41۔ ابوداؤد، حدیث 4283

42۔ مکارم شیرازی، 8:228-29

# کتابیات


1. قرآن مجید
2. ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، امام، تفسیر ابن کثیر، مترجم، محمد اکرم الازہری، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
3. ابو داؤد، سلیمان بن اشعث، امام، سنن ابو داؤد، دار السلام، ریاض
4. احمد بن حنبل، امام، مسند احمد، دار الحدیث، قاہرہ، طبع جدید
5. جرجانی، علی بن محمد، علامہ، التعریفات، مکتبہ نزاد مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ
6. الحویزی، علی بن جمعۃ، نور الثقلین، مطبعۃ الحکم، قم، ایران
7. الزبیدی، سید مرتضیٰ، علامہ، تاج العروس، مطبوعہ المطبعۃ الیخریہ، مصر، 1306ھ
8. الطبرسی، فضل بن حسن، شیخ، مجمع البیان، دار الکتب العلمیہ، بیروت
9. الہیثمی، علی بن ابی بکر، حافظ، مجمع الزوائد، مطبوعہ دار الکتب العربی، بیروت
10. عاملی، محمد بن حسن، شیخ، وسائل الشیعہ، احیاء التراث العربی، بیروت
11. قمی، عباس، شیخ، سفینۃ البحار، دار المصطفیٰ، بیروت، لبنان
12. محمد قطب شہید، سید، ظلال القرآن، اسلامی اکادمی، اردو بازار لاہور
13. مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، مترجم (سید صفدر حسین نجفی) مصباح القرآن ٹرسٹ، لاہور

# تفسیر نجوم الفرقان اور تدبر قرآن کی اختلافی مباحث کا تقابلی جائزہ

# Comparative Rview of Different Opinion of Nujūm-ul-Furqān and Tadabbur-i-Qur'ān

***Hafiz Abdul Ghaffar***
***Dr. Hafiz Khursheed Ahmad Qadri***

***Abstract:***

*The Holy Qur'ān is a comprehensive book that expresses everything in details. Anyhow, it needs to be interperated as Almighty Allah ordered us to prudence and research in Qur'ānic verses.The Qur'ān states: "Have they not contemplated the discourse." That is why the Muslim scholars of every era kept proposing solutions to new problems in the light of various interperations of the Qur'ān. Among these interperations the Nujūm-ul-Furqān min Tafsīr 'Āyātil-Qur'ān of 'Allama 'Abdul Razzaq Bhutrālwī and Tadabbur-i-Qur'ān of Amīn Aḥsan Iṣlāḥī are two prominent interperations of Qur'ān. In this paper, the comparative review of the various phenomena is presented in both the interperatations, the significance of the limitations of both the interpreters are discussed. Some of the contrarary views of both interperaters includes the point of view about the Harūf-i-Muqatta'āt, the location of Muqām-i-Ibrāhīm, the role of crow in burial of Hābīl, the obligation of Qasr Prayer and the fruits given to Hazrat Maryam was real or spiritual.*

***Key words:*** *Quran, interperation, Āyātil-Qur'ān, Comparative Review, Tadabbur-i-Qur'ān, Bhutrālwī, Iṣlāḥī.*

**کلیدی کلمات:** قرآن، تفسیر، آیات القرآن، تقابلی جائزہ، تدبّر قرآن، بھترالوی، اصلاحی۔

## تعارف

ہماری معاشی، سماجی، دینوی اور اخروی زندگی کے تمام مسائل کا حل قرآن کریم میں موجود ہے۔ قرآن کریم کی تفہیم کو سہل کرنے کے لئے مختلف زبانوں میں سینکڑوں تفاسیر لکھی گئی ہیں اور آج تک لکھی جا رہی ہیں۔ ہر دور میں علماء حق نے اس ذمہ داری کو بڑے احسن انداز میں نبھایا ہے۔ اسی طرح پاک وہند کے اس خطہ میں بھی بہت زیادہ کام

ہوا ہے۔ اس پورے دورانیے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو ان میں تفسیر تدبر قرآن اور نجوم الفرقان من تفسیر آیات القرآن نمایاں نظر آتی ہیں۔ یہ دونوں تفاسیر دو مختلف نقطہ ہائے نظر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں تفاسیر میں عقائد و احکام کے بارے اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس مضمون میں صاحب تدبر قرآن اور صاحب نجوم الفرقان کے مابین تفسیری مآخذ میں حدیث کی اہمیت، حروف مقطعات، مقام ابراہیم کی تعیین، ہابیل کو دفن کرنے میں کوّے کا کردار، قصر نماز کے وجوب کا مسئلہ اور حضرت مریمؑ کو دیئے گئے رزق کے متعلق جو بحث کی گئی ہے اس میں جمہور مفسرین کی آراء کی روشنی میں مطالعہ سے واضح ہوا ہے کہ علامہ بھترالوی کے مؤقف کو اسلاف کی تائید حاصل ہے جبکہ مولانا اصلاحی کی رائے ہر مقام پر جمہور مفسرین سے مختلف ہے۔

## قرآن، صحیفۂ ہدایت

قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کو عطا ہونے والا آخری اور مکمل صحیفۂ ہدایت ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب تک ملت اسلامیہ کی حیات اجتماعی قرآنی ہدایات کے زیر اثر رہی اور اس کی روح کو ملت اسلامیہ نے اپنے پیش نظر رکھا عروج اور غلبہ اس کا مقدر رہا، مگر اس ہدایت کو ترک کرتے ہی ملت اسلامیہ کی عظمت تاریخ کے صفحات کی زینت بن کر رہ گئی۔ ملت اسلامیہ کا یہ زوال اس کی دلیل ہے کہ اس امت کا تمام تر عروج قرآنی ہدایت سے وابستگی میں ہی مضمر ہے۔ قرآن حکیم اپنے قاری سے تعقل، تفکر اور تدبر کا تقاضا کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: "اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا "[1] یعنی: "تو کیا وہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔"

قرآن حکیم پر غور و فکر ہی اس سے ہدایت خیزی کا باعث بن سکتا ہے کیونکہ جب تک قرآن کریم سے تعلق مضبوط نہیں ہوگا اس کی تفہیم بھی ممکن نہیں۔ ہمارے اسلاف نے اس مقصد کے حصول کے لئے اپنے شب و روز لگائے، مشقتیں برداشت کیں اور بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے تفہیم قرآن کے لئے آسانیاں پیدا کیں۔ صحابہ کرام کا یہ معمول تھا کہ نبی ﷺ سے دس دس آیات سیکھا کرتے تھے اور جب تک ان دس آیات کے علوم اور ان کے عملی پہلوؤں کو جان نہ لیتے مزید آیات نہ سیکھتے۔ جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے حضرت عمر بن خطابؓ کے بارے میں روایت کیا ہے کہ وہ آٹھ سال تک سورۃ البقرہ کا علم حاصل کرتے رہے پھر صحابہ کرام کی طرح تابعین اور تبع تابعین اور متأخرین، محدثین اور فقہاء اور مفسرین نے بھی اس علم سے اپنی وابستگی کو قائم رکھا اور کلام اللہ کے صحیح فہم کی خاطر اپنی محنتوں کو صرف کیا اور اس طرح رسول اللہ ﷺ کی یہ علمی وراثت نسل در نسل منتقل ہوتی

رہی۔ اس سلسلہ کے دو وارث مولانا امین احسن اصلاحی اور علامہ عبد الرزاق بھترالوی ہیں جنہوں نے قرآن کریم کی تفاسیر لکھ کر اس فرض کفایہ کو ادا کیا۔

## امین احسن اصلاحی

امین احسن اصلاحی ۱۹۰۴ء میں ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ سرائے میر ضلع اعظم گڑھ کی مشہور دینی درسگاہ مدرسۃ الاصلاح میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۵ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد اسی مدرسہ میں بحیثیت مدرس تعینات ہوئے اور ساتھ ہی مولانا حمید الدین فراہی (م: ۱۹۳۰ء) سے استفادہ جاری رکھا۔ ۱۹۳۰ء میں مولانا فراہی کے انتقال کے بعد مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری (م: ۱۹۳۵ء) سے شرف تلمذ حاصل کیا اور سنن ترمذی پڑھی۔ اس عرصے میں ان کے تعلقات سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۷۹ء) سے استوار ہوئے اور ۱۹۴۱ء میں جب جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی گئی تو مولانا اصلاحی اس میں شامل ہو گئے اور اس کے شعبہ تصنیف و تالیف اور دعوت میں مشغول ہو گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد مولانا کم سے کم دس سال تک جماعت اسلامی سے وابستہ رہے۔ فروری ۱۹۵۷ء میں ماچھی گوٹھ کے مقام پر منعقد ہونے والے جماعت اسلامی کے ارکان کے اجتماع کے بعد ان میں اور مولانا مودودی میں اختلاف پیدا ہونے لگے یہاں تک کہ ۱۹ اگست ۱۹۵۷ء کو انہوں نے مستعفی ہونے کا اعلان کیا اور ۱۷ جنوری ۱۹۵۸ء کو باضابطہ طور پر جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کی۔ اس کے بعد انہوں نے قرآنِ پاک کی تفسیر لکھنے کا کام شروع کیا جو ۱۹۶۰ء میں ان کے رسالہ میثاق میں شائع ہونا شروع ہوا۔ طویل علالت کے بعد ۱۹۷۰ء میں صحت یاب ہوئے تو اپنی پوری توجہ سے تدبر قرآن کا کام شروع کیا جو ۱۲ اگست ۱۹۸۰ء میں مکمّل ہوا۔ دسمبر ۱۹۹۷ء میں انتقال کر گئے اور لاہور کے ڈیفنس قبرستان میں سپرد خاک کر دیئے گئے۔[2]

## تدبر قرآن

تدبر قرآن امین احسن اصلاحی کی اردو تفسیر قرآن ہے۔ مفسر نے اس تفسیر میں اپنے استاد حمید الدین فراہی کی فکر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تدبر قرآن میں مصنف نے وہ قرآنی فکر و فلسفہ پیش کیا ہے جو اس عہد کے چیلنج کا جواب ہے۔ خاص طور پر نظم قرآن اور ارتباط قرآن پر زیادہ زور دیا ہے۔ یہ تفسیر ۹ جلدوں میں ہے اسے ادارہ فاران فاؤنڈیشن نے طبع کیا ہے۔ ابتدا میں یہ آٹھ جلدوں میں شائع ہوئی اور اب یہ نو جلدوں میں چھپ رہی ہے۔ اس تفسیر کے متعلق دیباچہ میں آپ نے وضاحت کی ہے کہ جو کچھ میں نے سوچا وہ تمام کا تمام نہیں لکھا؛ البتہ یہ ضرور ہے کہ جو کچھ لکھا وہ بڑا سوچ سمجھ کر ہی لکھا ہے۔ جیسا کہ آپ لکھتے: "میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ میں نے سوچا وہ سب لکھ دیا ہے، لیکن یہ ایک امر واقعی ہے کہ جو کچھ لکھا ہے وہ اچھی طرح سوچ کر لکھا ہے۔"[3]

مندرجہ بالا عبارت سے واضح ہے کہ صاحب تدبر قرآن نے اپنی تفسیر کی بنیاد مروجہ تفسیری اصولوں پر نہیں رکھی۔ ان کے نزدیک تفسیری وسائل دو طرح کے ہیں: داخلی اور خارجی۔ داخلی وسائل میں قرآن کی زبان اور اس کا نظم نمایاں ہیں، جبکہ خارجی وسائل میں روایات، آثار، تاریخ اور سابق آسمانی صحیفے وغیرہ شامل ہیں۔ جیسا کہ تفسیر کے مقدمہ میں فہم قرآن کے وسائل کی سرخی کے تحت تفسیر کے منہج واسلوب کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "میں نے اس میں فہم قرآن کے ان وسائل و ذرائع کو اصل اہمیت دی ہے جو خود قرآن کے اندر موجود ہیں۔ مثلاً قرآن کی زبان، قرآن کا نظم اور قرآن کے نظایر و شواہد، دوسرے وسائل جو قرآن سے باہر کے ہیں مثلاً حدیث، تاریخ، سابق آسمانی صحیفے اور تفسیر کی کتابیں۔" [4]

## علامہ عبدالرزاق بھترالوی

علامہ قاضی حافظ عبد الرزاق بھترالوی بن مولانا قاضی عبد العزیز حطاروی بھترال ضلع راولپنڈی کے ایک علمی گھرانے کے چشم وچراغ ہیں۔ یہ خانوادہ قاضی خاندان کے نام سے معروف ہے۔آپ کے آباؤاجداد کا شمار اپنے زمانہ کے معروف علماء کرام اور مدرسین میں ہوتا تھا۔ بالخصوص حضرت علامہ مولانا قاضی برھان الدینؒ وہ جلیل القدر ہستی ہیں کہ جنہیں سید مہر علی شاہ گولڑویؒ (م:۱۹۳۷ء) کے استاد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اسی طرح استاد الصرف والنحو حضرت علامہ قاضی غلام رسول بھترالوی کا تعلق بھی اسی علم دوست گھرانے سے تھا۔ آپ نے پنجاب کے مختلف مستند اداروں میں دینی تعلیم حاصل کی۔ آپ کے جلیل القدر اساتذہ میں مولانا غلام یوسف گجراتی، مولانا عبدالواحد، مولانا محمد عرفان نوری، مولانا غلام محمود ہزاروی، مفتی عزیز احمد قادری، مفتی محمد افضل حسین، مفتی محمد حسین نعیمی (م: ۱۹۹۸ء) علامہ محمد اشرف سیالوی (۲۰۱۳ء) اور قاضی محمد اسرار الحق حقانی کے اسماء مبارکہ شامل ہیں۔

علامہ عبد الرزاق بھترالوی (پ: ۱۹۴۷ء) کی شخصیت اہل علم کے حلقہ میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی میں ۴۰ سال تک درس وتدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے اور اب اپنے ادارہ " جامعہ جماعتیہ مہر العلوم " شکریال راولپنڈی میں فیضِ علم تقسیم فرمارہے ہیں۔ جامع مسجد غوثیہ ایف سکس ون اسلام آباد میں بطور خطیب دعوت و تبلیغ کی ذمہ داریاں نبھاتے رہے ہیں۔ درس وتدریس اور وعظ و خطابت کے ساتھ ساتھ تحریر کا میدان بھی آپ کے پیشِ نظر رہا۔ آپ کی نوکِ قلم سے بہت سی کتب وجود پا کر اہل علم سے داد وصول کر چکی ہیں۔ درسی کتب کے حواشی اور شروحات آپ کا خاص میدان رہا ہے۔ آپ کی تحریر کردہ شروحات اور حواشی کو مدارس کے طلباء اور اساتذہ میں قبول عام حاصل ہوا ہے۔ وطنِ عزیز کے علاوہ بیرون

ممالک میں بھی آپ کے تحریر کردہ حواشی اور شروحات کو ایک خاص شہرت حاصل ہے۔ سید حسین الدین شاہ مہتمم و شیخ الحدیث جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی نجوم الفرقان کی پہلی جلد کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ:

"چند سال پہلے مجھے ساؤتھ افریقہ جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک علمی مجلس میں انڈیا سے تشریف لائے ہوئے ایک عالم دین سے ملاقات ہوئی جب انہیں یہ علم ہوا کہ میرا تعلق جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی پاکستان سے ہے تو بڑی خوشی کا اظہار فرمایا اور بتایا کہ حضرت مولانا عبد الرزاق چشتی بھترالوی کا نور الایضاح پر عربی حاشیہ ہمارے ہاں بڑا مقبول ہے۔"[5]

## نجوم الفرقان من تفسیر آیات القرآن

عصر حاضر میں "نجوم الفرقان من تفسیر آیات القرآن" کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ مفسر زیر تفسیر آیت کا ترجمہ کنز الایمان سے نقل کرتے ہیں اور پھر اس کی تسہیل کرتے ہوئے کنز الایمان کی تقریباً سو سال پرانی اردو کو جدید رنگ دینے کے لئے آپ اپنا ترجمہ قرآن لکھتے ہیں۔ آیات کا لغوی و اصطلاحی معنیٰ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ صرفی، نحوی بحث کرتے ہیں۔ شان نزول کی روایات بیان کرنے کے بعد اسلاف کی تحقیقات اور آراء سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔ "راقم کی رائے" کی سرخی کے تحت اپنا موقف بیان کرتے ہیں۔ یہ تفسیر ۲۲ جلدوں پر مشتمل ہے۔ آج جون ۲۰۱۹ء تک بارہ جلدیں بازار میں دستیاب ہیں۔ ان بارہ جلدوں میں سورۃ الفاتحہ سے لے کر سورۃ التوبہ کی آیت ۴۰ تک کی تفسیر حوالہ قرطاس کی گئی ہے۔ یہ بارہ جلدیں دس ہزار (۱۰۰۰۰) صفحات پر مشتمل ہیں۔ باقی جلدیں برق رفتاری سے کمپوزنگ کے مراحل سے گذر رہی ہیں۔

### اختلافی مباحث

اس مضمون میں تفسیر "تدبر قرآن" اور "نجوم الفرقان" میں موجود مختلف فیہ ابحاث کا تحقیقی و تقابلی جائزہ لیتے ہوئے تفسیری مآخذ میں دونوں مفسرین کے نزدیک حدیث کی اہمیت، حروف مقطعات سے متعلق آراء، مقام ابراہیم کی تعیین، ہابیل کو دفن کرنے میں کوّے کا کردار، قصر نماز کے وجوب کا مسئلہ اور حضرت مریمؑ کو دیا گیا رزق حقیقی تھا یا روحانی جیسے مسائل میں دونوں مفسرین کی آراء کا تقابلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

### تفسیری مآخذ میں حدیث کی اہمیت

وہ ہستی جس پر قرآن کریم کا نزول ہوا اسی کی زبان کو خدا کے کلام کا ترجمان بنا دیا گیا تاکہ لوگ آپ کے ارشادات کو پڑھ کر کلام الٰہی کے مفاہیم کے سمجھنے میں مدد لے سکیں۔ اللہ تعالیٰ کے بعد نبی کریم ﷺ کی اطاعت تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح طور پر ارشاد فرما دیا کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت

درحقیقت میری ہی اطاعت ہے۔ ارشاد ربانی ہے: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللهَ [6] یعنی: "جس نے رسول کا حکم مانا بے شک اُس نے اللہ کا حکم مانا۔" قرون اولیٰ سے لے کر آج تک تمام اہل علم ذخیرہ کتب حدیث کو تفسیر کا ایک انتہائی اہم اور مستند ذریعہ سمجھتے آئے ہیں لیکن ایسے مفسرین جو نقلی علوم کی بجائے عقلی علوم کو ترجیح دیتے ہیں وہ روایات کے متعلق مختلف شکوک و شبہات کا شکار ہیں۔ جبکہ جمہور علماء کرام اسماء الرجال کی روشنی میں اس ذخیرہ پر مکمل بھروسہ کرتے ہیں۔ ذیل میں دونوں مفسرین کی آراء کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

## صاحب نجوم الفرقان کی رائے

علامہ بھترالوی احادیث نبوی ﷺ کو تفسیر قرآن کا اہم ترین ذریعہ قرار دیتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں جتنے بھی احکام بیان ہوئے ہیں ان کی تفہیم احادیث نبوی ﷺ اور سنت رسول ﷺ کے بغیر ممکن نہیں۔ مثلاً نماز کے اوقات، رکعات کی تعداد، زکوۃ کے لئے نصاب کی مقدار اور اسی طرح حلال و حرام کے احکام وغیرہ۔ احادیث صحیحہ کو تفسیر قرآن میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ لہٰذا انہیں چھوڑ کر دیگر ذرائع کو اہمیت دینا سراسر گمراہی ہے جیسا کہ آپ لکھتے ہیں:

> "قرآن پاک میں احکام مجمل ذکر کئے گئے ہیں۔ حدیث پاک میں ان کی وضاحت ہے قرآن پاک میں نماز کا ذکر ہے لیکن اوقات، تعداد، رکعات، ارکان، شرائط، واجبات سنتیں، مکروہات، اور مفسدات حدیث پاک سے ہی ثابت ہیں۔ اسی طرح زکوۃ کا قرآن پاک میں ذکر ہے لیکن زکوۃ کی مقدار نصاب کی تفصیل حدیث پاک سے ثابت ہے۔ اسی طرح روزہ حج اور تمام امور شرعیہ کی تفصیل حدیث پاک سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ تمام قضایا، احکام دینیہ حلال و حرام میں تمیز اور اخروی احوال کی تفصیل قرآن پاک، حدیث پاک اور اجماع امت سے حاصل کی جائے۔ منکرین کے باطل اقوال کی طرف توجہ کرکے متردد ہونا یا انکار حدیث پاک دین و دنیا کو برباد کرنے کے مترادف ہے۔" [7]

## صاحب تدبر قرآن کی رائے

مولانا امین احسن اصلاحی تفسیر قرآن کے لئے احادیث مبارکہ کی قبولیت کو بعض دیگر علوم کے ساتھ مشروط کرتے ہیں۔ تنہا حدیث مبارکہ کو آیات قرآنی کی تفسیر کے لئے قابل اعتبار نہیں سمجھتے بلکہ ان کا کہنا ہے کہ اس سے قرآن کریم کی قطعیت کو نقصان پہنچے گا۔ مولانا اصلاحی کی رائے یہ ہے کہ اگرچہ روایات صحت کے معیار پر پورا بھی اترتی ہوں اس کے باوجود شکوک و شبہات سے پاک نہیں۔ لہٰذا صرف ان روایات کی روشنی میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ آپ لکھتے ہیں:

"اگران روایات کی تحقیق و تنقید کرکے ان کے اندر جو مغز ہے اس کو الگ بھی کیا جاسکے جب بھی تنہا انہی کو تفسیر میں فیصلہ کن چیز قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ یہ روایات صحت کے معیار پر پوری اترنے کے بعد بھی ظن کے شائبہ سے پاک نہیں ہو سکتی ہیں۔ اس لئے اگر قرآن مجید کی تفسیر میں تنہا انہی کو فیصلہ کن چیز مان لیا جائے تو قرآن مجید کی قطعیت کو نقصان پہنچے گا اور یہ چیز کسی طرح بھی گوارا نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے دلائل و شواہد کے ساتھ مل کر تو بلا شبہ یہ روایات قرآن مجید کے صحیح مفہوم کی تعیین میں بہت زیادہ مددگار ہو سکتی ہیں لیکن تنہا انہی کی مدد سے کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا"۔[8]

## راجح مؤقف

مندرجہ بالا دونوں مفسرین کی آراء کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ علامہ بھترالوی قرآن کریم کی تفسیر میں صحیح احادیث پر مکمل بھروسہ کرتے ہیں جبکہ مولانا اصلاحی ایسا نہیں کرتے۔ علامہ اصلاحی کا یہ کہنا کہ اگر کوئی حدیث اسماء الرجال کی طرف سے وضع کردہ صحت حدیث کے اصولوں پر پورا بھی اتر رہی ہو تو پھر بھی تفسیر قرآن کے لئے اس پر مکمل بھروسہ نہیں کیا جائے گا جب تک دیگر معاون علوم کی روشنی میں اس حدیث کی جانچ پڑتال نہ کرلی جائے۔ یہ اصول چودہ سو سالہ تفسیری اصولوں کے برعکس ہے۔ علامہ بھترالوی حدیث پاک کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ایسے مفسرین کا شدت سے رد کرتے ہیں جو مختلف قسم کے خود ساختہ اصولوں کی آڑ میں حدیث پاک کا انکار کرتے ہیں اور اسے دین میں حجت قرار دینے سے لیت و لعل سے کام لیتے ہیں۔

## حروف مقطعات کے بارے میں تحقیق

حروف مقطعات سے مراد ایسے حروف ہیں جن کے ہجے نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کا ترجمہ ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں ۲۹، سورتیں ایسی ہیں جن کے شروع میں یہ حروف آئے ہیں۔ جہاں بھی قرآن کریم میں یہ حروف آئے ہیں وہ سورتوں کی ابتداء میں آئے ہیں یعنی درمیان میں نہیں ہیں۔ بعض سورتوں کے آغاز میں آنے والے حروف مقطعات ایک ایک ہیں جیسے ن، ق وغیرہ۔ بعض میں دو دو ہیں جیسے حٰم، یٰس۔ بعض سورتوں میں تین تین حروف آئے ہیں جیسے الٓم، طٰسٓم وغیرہ۔ اسی طرح بعض سورتوں کے شروع میں چار حروف آئے ہیں جیسے الٓمٓر، اور بعض سورتوں کے شروع میں پانچ حروف مقطعات آئے ہیں جیسے سورہ مریم کے آغاز میں کٓھٰیٰعٓصٓ۔ قرآن حکیم وہ واحد آسمانی کتاب ہے جس میں حروف مقطعات دکھائی دیتے ہیں۔ دیگر مقدس کتابیں جس حالت میں بھی ہیں ان میں اس طرح کے حروف دکھائی نہیں دیتے۔ گویا اس امر میں آسمانی کتابوں میں قرآن منفرد ہے۔ قرآن حکیم کی جن سورتوں سے پہلے یہ حروف وارد ہوئے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

البقرہ، آل عمران، اعراف، یونس، ھود، یوسف، رعد، ابراھیم، حجر، مریم، طٰہٰ، شعراء، نمل، قصص، عنکبوت، روم، لقمان، سجدہ، یٰسٓ، ص، مومن، فصلت، شوریٰ، زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، ق، القلم
ان سورتوں میں سے پہلی ۲، مدنی ہیں اور باقی ۲۷، مکی ہیں۔ حروف مقطعات کے متعلق مفسرین کرام کی مختلف آراء واقوال ہیں۔ علامہ بھترالوی اور مولانا اصلاحی کی آراء میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ بھترالوی صاحب متقدمین کی آراء کے مطابق اللہ ورسولہ اعلم کو کافی سمجھتے ہیں لیکن اصلاحی صاحب متقدمین آراء کو ایک طرف رکھ کر اپنے استاد فراہی صاحب کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔

### علامہ بھترالوی کی رائے

حروف مقطعات کے حوالے سے علامہ بھترالوی کی رائے یہ ہے کہ ان کا علم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو ہی ہے۔ قیامت تک ان کے حقیقی معنیٰ کا کسی کو کوئی علم نہیں ہو سکتا۔ یہ متشابہات سے ہیں ان سے جو بھی اللہ تعالیٰ کی مراد ہے وہ حق ہے لیکن ہمیں اس کا علم نہیں جیسا کہ آپ لکھتے ہیں:

"ان الفاظ مبارکہ کی مراد کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہی جانتے ہیں۔ بعض سورتوں کی ابتداء میں جو اس قسم کے الفاظ آئے ہوئے ہیں ان کو حروف مقطعات کہا جاتا ہے ان کو علیحدہ علیحدہ کرکے پڑھا جاتا ہے۔ یعنی یوں پڑھا جاتا ہے۔ الف، لام، میم۔ یہ متشابہات سے ہیں۔ متشابہ اسے کہا جاتا ہے جس کی مراد کو پہچاننے کی امید ختم ہو جائے جو بہت زیادہ خفاء میں ہو، جس کے ظاہر ہونے کی امید بالکل نہ پائی جائے۔ متشابہ کا حکم یہ ہے کہ عقیدہ یہ ہو کہ ان سے جو بھی اللہ تعالیٰ کی مراد ہے وہ حق ہے۔ ہمیں ان کا علم قیامت تک حاصل نہیں ہو سکے گا۔"[9]

### مولانا اصلاحی کی رائے

حروف مقطعات کے متعلق مولانا اصلاحی نے مکمل طور پر امام حمید الدین فراہی کی رائے پر اعتماد کیا ہے۔ جو رائے قائم کی ہے وہ درج ذیل ہے:

"ان حروف پر ہمارے پچھلے علماء نے جو آراء ظاہر کی ہیں ہمارے نزدیک وہ تو کسی مضبوط بنیاد پر مبنی نہیں ہیں۔ اس وجہ سے ان کا ذکر کرنا کچھ مفید نہیں ہوگا۔ البتہ استاذ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے اجمالاً میں یہاں پیش کرتا ہوں۔ اس سے اصل مسئلہ اگرچہ حل نہیں ہوتا لیکن اس کے حل کے لئے

ایک راہ کھلتی ضرور نظر آتی ہے۔ کیا عجب کہ مولانا نے جو سراغ دیا ہے دوسرے اس کی رہنمائی سے کچھ مفید نشاناتِ راہ اور معلوم کر لیں اور اس طرح درجہ بدرجہ تحقیق کے قدم کچھ اور آگے بڑھ جائیں۔"[10]

مولانا اصلاحی امام فراہی کے نظریہ کی تائید کرتے ہوئے حروف مقطعات کو سورتوں کے نام یا ان میں بیان ہونے والے انسانوں، جانوروں، پرندوں اور حشرات الارض کے متعلق جو واقعات ہیں ان کے اسماء سے موسوم کرتے ہوئے امام فراہی کے مؤقف کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

"مولانا اپنے نظریہ کی تائید میں سورہ "ن" کو پیش کرتے ہیں۔ حرف نون اب بھی اپنے قدیم معنی ہی میں بولا جاتا ہے، اس کے معنی مچھلی کے ہیں اور جو سورہ اس نام سے موسوم ہوئی ہے اس میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر صاحب الحوت (مچھلی والے) کے نام سے آیا ہے۔ مولانا اس نام کو پیش کرکے فرماتے ہیں کہ اس سے ذہن قدرتی طور پر اس طرف جاتا ہے کہ اس سورہ کا نام نون (ن) اسی وجہ سے رکھا گیا ہے کہ اس میں صاحب الحوت (یونس علیہ السلام) کا واقعہ بیان ہوا ہے جن کو مچھلی نے نگل لیا تھا۔ پھر کیا عجب ہے کہ بعض دوسری سورتوں کے شروع میں جو حروف آئے ہیں وہ بھی اپنے قدیم معانی اور سورتوں کے مضامین کے درمیان کسی مناسبت ہی کی بنا پر آئے ہوں۔"[11]

آخر میں مولانا اصلاحی ان حروف مقطعات کی بحث کو سمیٹتے ہوئے نتیجہ کے طور پر لکھتے ہیں کہ یہ صرف ایک نظریہ ہی ہے اس کے سوا کچھ نہیں لہٰذا اس پر اعتماد کرنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ جیسا کہ ان الفاظ سے واضح ہے:

"میرے نزدیک اس کی حیثیت ابھی تک ایک نظریہ سے زیادہ نہیں ہے۔ جب تک تمام حروف کے معانی کی تحقیق ہو کر ہر پہلو سے ان ناموں اور ان سے موسوم سورتوں کی مناسبت واضح نہ ہو جائے اس وقت تک اس پر ایک نظریہ سے زیادہ اعتماد کر لینا صحیح نہیں ہو گا۔ یہ محض علوم القرآن کے قدر دانوں کے لئے ایک اشارہ ہے، جو لوگ مزید تحقیق و جستجو کی ہمت رکھتے ہیں وہ اس راہ میں قسمت آزمائی کریں۔ شاید اللہ تعالیٰ اس راہ سے یہ مشکل آسان کر دے۔"

## تقابلی جائزہ

دونوں مفسرین کے تقابلی جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بھترالوی نے اپنی رائے متقدمین کی آراء کی روشنی میں قائم کی ہے جبکہ اصلاحی نے علماء سلف کو یکسر رد کرکے صرف و صرف مولانا فراہی کی رائے کو ہی ترجیح دی ہے اور دیگر مفسرین کی آراء کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کا ذکر کرنا بھی مفید نہیں۔ جمہور علماء کی آراء کو پس پشت ڈال کر صرف

اپنے استاد کی رائے کو ترجیح دینا محل نظر ہے۔ اصلاحی دوسرے مفسرین کی تمام آراء کو رد کرتے ہیں اور ساتھ ہی ان حروف کے بارے میں اپنی رائے قائم کرتے ہوئے ان حروف کو سورتوں کے نام قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ [حروف] جس سورہ میں بھی آئے ہیں بالکل شروع میں اس طرح آئے ہیں جس طرح کتابوں، فصلوں اور ابواب کے شروع میں ان کے نام آیا کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان سورتوں کے نام ہیں۔ قرآن نے جگہ جگہ ذٰلک اور تلک کے ذریعہ سے ان کی طرف اشارہ کرکے ان کے نام ہونے کو اور زیادہ واضح کر دیا ہے۔ حدیثوں سے بھی ان کا نام ہی ہونا ثابت ہوتا ہے۔"[12]

بعض وہ سورتیں جو حروف مقطعات کے نام سے ہیں جیسے طٰہٰ، یٰس اور قٓ یہ نام آپ ﷺ کے رکھے ہوئے ہیں۔ اگر ان حروف کے معنٰی ہوتے تو آپ ﷺ ضرور بتاتے یا صحابہ کرام پوچھتے لیکن ایسی کوئی روایت نہیں کہ جس سے اس کے متعلق آگاہی ہو سکے۔ لہٰذا یہ حروف قرآن حکیم کے متشابہات میں سے ہیں۔ ان کے معنی صرف اللہ تبارک و تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ جیساکہ سورہ آل عمران میں فرمایا گیا ہے: "وَ مَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ"[13] یعنی: "متشابہات کی تاویل صرف اللہ ہی جانتا ہے۔"

**سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نظریہ:** حروف مقطعات کا استعمال عام طور پر معروف تھا۔ خطیب اور شعراء دونوں اس اسلوب سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ اب بھی کلام جاہلیت کے جو نمونے محفوظ ہیں ان میں اس کی مثالیں ہمیں ملتی ہیں۔ اس استعمال عام کی وجہ سے یہ مقطعات کوئی چیستاں نہ تھے جس کو بولنے والے کے سوا کوئی نہ سمجھتا ہو۔"[14] **صاحب معارف القرآن لکھتے ہیں:** "ہو سکتا ہے کہ رسول کریم ﷺ کو اس کا علم بطور ایک راز کے دیا گیا ہو جس کی تبلیغ امت کے لئے روک دی گئی ہو۔"[15]

## مذکورہ بالا مؤقف پر صاحب نجوم الفرقان کا تبصرہ

علامہ بھترالوی نے صاحب معارف القرآن کے "ہو سکتا ہے" کے الفاظ پر گرفت کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ آپ ﷺ کو ان حروف کے معانی کا یقینی علم حاصل تھا۔ اس لئے یہ کہنا کہ ہو سکتا ہے آپ ﷺ کو ان کا علم ہو تو یہ شک والی بات درست نہیں۔ جیساکہ آپ لکھتے ہیں:

"راقم نے معتبر تفاسیر اور کتب اسلاف سے جو بحث نقل کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو (حروف مقطعات کا) یقینی طور پر علم تھا۔ لیکن صاحب معارف القرآن نے کہا ہو سکتا ہے علم ہو یہ وجہ فرق بھی ہے ان کے اور راقم کے نظریات میں۔"[16]

### راجح مؤقف

مندرجہ بالا عبارت میں مفتی صاحب نے لفظِ ہو سکتا ہے استعمال کیا ہے جبکہ سید مودودی نے لکھا ہے کہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو سمجھ سے بالاتر ہو اور علامہ اصلاحی نے کہا کہ ان کا ذکر کرنا کچھ مفید نہیں ہوگا یہ صرف ایک نظریہ ہی ہے۔ علامہ بھترالوی نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ آپ ﷺ کو حروف مقطعات کا یقینی علم تھا؛ اس کے لئے شک کا صیغہ استعمال کرنا یا غیر مفید قرار دینا مناسب نہیں ہے۔ مذکورہ بالا تمام آراء کے تناظر میں صاحب نجوم الفرقان کی رائے زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے کہ یہ حروف متشابہات سے ہیں اور ان کا یقینی علم اللہ اور اس کے رسول کو ہی ہے۔

### مقام ابراہیم سے متعلق رائے

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "وَ اتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّى "[17] یعنی: "اور ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کا مقام بناؤ۔ "مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے جو بیت اللہ کی تعمیر کے وقت حضرت ابراہیمؑ نے اپنے قد سے اونچی دیوار تعمیر کرنے کے لئے استعمال کیا تھا تاکہ وہ اس پر اونچے ہو کر دیوار کو بلند کر سکیں۔ مقام ابراہیم خانہ کعبہ سے تقریبا سوا، ۱۳ میٹر مشرق کی جانب قائم ہے۔ اس مقام کو مصلے کا درجہ حاصل ہے اور امام کعبہ اسی کی طرف سے کعبہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھاتے ہیں۔ طواف کے بعد یہاں دو رکعت نفل پڑھنے کا حکم ہے۔ احناف کے نزدیک طواف کے بعد دو رکعت واجب ہیں، نفل نہیں۔ جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ مقام ابراہیم مخصوص پتھر ہے جس پر ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کے نشانات موجود ہیں لیکن بعض کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد یہ مخصوص پتھر نہیں ہے بلکہ پورا حرم ہے علامہ بھترالوی کے نزدیک اس سے مراد مخصوص پتھر ہے، جبکہ مولانا اصلاحی کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد پورا حرم ہے۔ دونوں مفسرین کی رائے درج ذیل ہے۔

### صاحب نجوم الفرقان کا مؤقف

علامہ بھترالوی کے نزدیک مقام ابرہیم سے مراد وہ مخصوص پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر آپ نے خانہ کعبہ کی دیواروں کو بلند کیا اور اسی پر کھڑے ہو کر لوگوں کو حج کی دعوت دی جیسا کہ آپ لکھتے ہیں:

> "مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پاؤں رکھے اور آپ کی بہو یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی زوجہ نے آپؑ کے پاؤں کو دھویا اور اسی پتھر پر آپؑ نے کھڑے ہو کر کعبہ شریف کی تعمیر کی اور اسی پتھر پر کھڑے ہو کر تعمیرِ کعبہ کے بعد آپؑ نے لوگوں کو حج کی دعوت دی۔"[18]

**صاحب تدبر قرآن کا مؤقف**

مقام ابراہیم کے متعلق مولانا اصلاحی فرماتے ہیں کہ اس کے بارے میں علماء کرام کی دو آراء ہیں ایک یہ کہ اس سے مراد مخصوص پتھر اور دوسری یہ کہ اس سے مراد پورا حرم اور یہی تأویلی معنٰی درست ہے کہ اس سے پورا حرم ہی مراد لیا جائے جیسا کہ آپ لکھتے ہیں:

"یہاں آیت میں مقام ابراہیم کا لفظ آیا ہے۔ مقام سے کیا مراد ہے؟ علماء تفسیر سے اس بارے میں دو قول منقول ہیں ایک گروہ کے نزدیک اس سے مراد وہ پتھر جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس پر کھڑے ہو کر خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی دوسرے گروہ کے نزدیک اس سے مراد حرم کا پورا علاقہ ہے۔ اس گروہ نے مقام کے لفظ کو کسی مخصوص کھڑے ہونے کی جگہ کے بجائے مسکن و مستقر کے مفہوم میں لیا ہے ہمارے نزدیک یہی تأویل صحیح ہے۔"[19]

**دیگر مفسرین کی آراء**

**ابن کثیر مقام ابراہیم کے متعلق لکھتے ہیں:** "مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبہ کی دیواریں اٹھارہے تھے۔"[20] **مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں:** "مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام قدم مبارک کا بطور معجزہ نشان پڑ گیا تھا اور جس کو تعمیر بیت اللہ کے وقت آپ نے استعمال کیا تھا۔"[21] **علامہ کیلانی لکھتے ہیں:** "مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر سیدنا ابراہیم علیہ السلام خانہ کعبہ کی تعمیر کرتے رہے۔ اسی پر کھڑے ہو کر آپ نے لوگوں کو حج کے لئے پکارا۔"[22]

**راجح رائے**

مندرجہ بالا تمام دلائل کی روشنی میں اگر دونوں مفسرین کی آراء کو دیکھا جائے تو صاحب نجوم الفرقان کی رائے جمہور علماء کی آراء کے مطابق ہے جبکہ صاحب تدبر قرآن کی رائے محل نظر ہے کیونکہ جب قرآن کریم نے مقام ابراہیم کہہ کر خطاب کیا ہے تو پھر عقل یہی تقاضا کرتی ہے کہ اس سے مراد وہی پتھر ہو جس کی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہے۔ جس طرح صفا و مروہ کا نام لیا جائے تو اس سے مراد وہی دو پہاڑیاں ہوتی ہیں جن کی نسبت حضرت ہاجرؓہ کے ساتھ ہے۔ پورا حرم مراد نہیں اسی طرح مقام ابراہیم سے بھی پورا حرم مراد لینا درست نہیں۔ لہٰذا اس سے مراد وہی پتھر ہوگا جس کی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہے اور یہی جمہور مفسرین کی رائے ہے۔

## ہابیل کو دفن کرنے میں کوّے کا کردار

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے : "فَبَعَثَ اللّٰہُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ "[23]

"تو اللّٰہ نے ایک کوّا بھیجا زمین کریدے، تاکہ اسے دکھائے کیونکر اپنے بھائی کی لاش چھپائے۔"

قرآن کریم کی مندرجہ بالا آیت مبارکہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہابیل و قابیل کا قصہ بیان کیا ہے۔ قابیل نے جب ہابیل کو شہید کر دیا تو قابیل یہ نہ جانتا تھا کہ اب اس مردہ جسم کو کہاں ٹھکانے لگایا جائے کیونکہ یہ تاریخ انسانیت کا پہلا قتل تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک کوّا بھیجا جس نے قابیل کو سمجھانے کے لئے زمین کھودی اور اس میں مردہ کوے کو دفن کر دیا جس سے قابیل سمجھ گیا کہ اسے بھی ایسا ہی کرنا چاہئے۔ جمہور علماء کی رائے یہی ہے کہ کوے نے قابیل کے سامنے یہ عمل کیا تو قابیل کو بات سمجھ آگئی لیکن اصلاحی کی اس مقام پر رائے جمہو علماء کے خلاف ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ کوّا حقیقت میں شیطان تھا جو کوّے کے بھیس میں آیا تھا۔ اسی نے پہلے قابیل سے قتل کروایا اور پھر دفن کا طریقہ بھی سمجھانے چلا آیا جبکہ بھترالوی کی رائے دیگر مفسرین کے ساتھ ہے کہ یہ شیطان نہیں بلکہ کوّا ہی تھا جیسا کہ درج ذیل عبارت سے واضح ہے۔

## صاحب نجوم الفرقان کی رائے

مندرجہ بالا آیت مبارکہ کی تفسیر میں صاحب نجوم الفرقان نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ جب قابیل نے ہابیل کو شہید کر دیا تو اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ ہابیل کی نعش کو کس طرح ٹھکانے لگائے لہٰذا اللہ کی طرف سے ایک کوّا آیا اور اس نے قابیل کو میت دفن کرنے کا طریقہ سمجھا دیا جیسا کہ آپ لکھتے ہیں :

"جب قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تو لاش کو وہاں جنگل میں ہی چھوڑ دیا جہاں قتل کیا تھا لیکن جب دیکھا کہ لاش پر درندے اور پرندے آنا شروع ہو گئے تو اس نے لاش کو بوری میں ڈال کر اٹھالیا اس طرح لاش کو اٹھائے پھرتا رہا، جب لاش بدبودار ہو گئی اور اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ لاش کو کدھر کرے کیونکہ یہ زمین پر واقع ہونے والا پہلا قتل تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی مشکل کو حل کرنے کے لئے ایک کوے کو بھیجا جس نے اپنی چونچ اور پنجوں سے زمین کو کریدا اور دوسرے کوے کی لاش کو چھپایا تو قابیل کو پتہ چل گیا کہ اسے بھی اپنے بھائی کی لاش کو اسی طرح چھپانا ہے جب دیکھا کہ کوا مجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے تو کہا ہائے خرابی، ہائے افسوس کیا میں اس کوے سے بھی زیادہ عاجز آگیا تھا کہ مجھے پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ میں اپنے بھائی کی لاش کو کیسے چھپاؤں تو وہ اپنے کئے پر پشیمان ہو گیا۔"[24]

### صاحب تدبر قرآن کی رائے

صاحب تدبر قرآن کی رائے یہ ہے کہ ہابیل کی شہادت کے پورے واقعہ میں شیطان نے قابیل کو ورغلایا اور پھر کوے کے روپ میں آکر دفنانے کا طریقہ بھی بتلایا اور یہ کوئی کوا نہیں تھا بلکہ یہ شیطان تھا جو کوے کی شکل میں وارد ہوا تھا، جیسا کہ آپ لکھتے ہیں:

"ہمارے نزدیک یہ کوّا شیطان کی مثال ہے۔ شیطان نے پہلے تو قابیل کے نفس کے اندر وسوسہ اندازی کرکے اس کو بھائی کے قتل پر آمادہ کیا اور جب وہ یہ جرم کر گزرا تو کوّے کے واسطے سے اس کو جرم کے چھپانے کی تدبیر سجھائی اور اس طرح اولاد آدم کو گمراہ کرنے کی جو قسم اس نے کھائی تھی اس کی تکمیل کی راہ میں ایک نہایت کامیاب قدم اس نے اٹھایا۔"[25]

### تقابلی جائزہ

مندرجہ بالا دونوں عبارتوں سے واضح ہے کہ دونوں مفسرین میں واضح اختلاف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کو اللہ کی نافرمانی کی طرف شیطان ہی ابھارتا ہے جیسا کہ مولانا اصلاحی نے لکھا ہے لیکن جو بات قرآن کریم میں وضاحت کے ساتھ بیان کردی گئی ہے اس کی بے جا تأویل کرنا درست نہیں۔ صرف بھترالوی ہی نہیں بلکہ دیگر علماء کرام بھی اسی طرف گئے ہیں کہ یہ آنے والا پرندہ کوا ہی تھا شیطان نہیں تھا جیسا کہ دیگر مفسرین کی تفاسیر سے واضح ہے۔

### دیگر مفسرین کی آراء

**حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:** "جب اس (قابیل) نے اپنے بھائی کو قتل کر ڈالا تو چونکہ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی لاش کو کس طرح چھپائے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے دو کوّے بھیجے جو بھائی بھائی تھے، وہ دونوں لڑنے لگے ایک نے دوسرے کو مار ڈالا پھر اس نے زمین میں گڑھا کھود کر اس میں لاش رکھی اور اس پر مٹی ڈال دی۔"[26] **صاحب تفہیم القرآن کی رائے:** " اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک کوے کے ذریعہ سے آدم کے اس غلط کار بیٹے کو اس کی جہالت و نادانی پر متنبہ کیا۔"[27] **صاحب تفسیر مظہری کی رائے:** اللہ نے کوّے کو دفن کرنے کی تدبیر بتائی اور براہ راست قابیل کو نہیں بتائی بلکہ کوّے کو رہنما بنایا یہ تنبیہ ہے اس امر پر کہ اللہ کی نظر میں قابیل کوے سے بھی زیادہ حقیر تھا۔"[28] **صاحب تبیان القرآن لکھتے ہیں:** اللہ تعالیٰ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کرید رہا تھا، پھر اس نے زمین میں اس مردہ کوے کو دفن کر دیا۔ تب اس نے کہا ہائے افسوس میں اس کوے جیسا بھی نہیں ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپا دیتا۔"[29]

**راجح رائے**

مندرجہ بالا تمام مفسرین کی آراء کی روشنی میں اگر غیر جانب دارانہ موازنہ کیا جائے تو علامہ بھتر الوی کی رائے قوی معلوم ہوتی ہے جبکہ اس معاملہ میں اصلاحی تنہا کھڑے نظر آتے ہیں کیونکہ قرآن و سنت بھی اسی طرف رغبت دلا رہے ہیں کہ آنے والا پرندہ کوا تھا نہ کہ شیطان۔

## قصر نماز کے وجوب کا مسئلہ

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا"[30]

"اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر گناہ نہیں کہ بعض نمازیں قصر سے پڑھو (یعنی چار رکعت فرض کی جگہ دو پڑھو) اگر تمہیں اندیشہ ہے کہ کافر تمہیں ایذاء دیں گے۔ بے شک کفار تمہارے کھلے دشمن ہیں۔"

آپ ﷺ اور صحابہ کرام کا دوران سفر قصر نماز کے متعلق موقف درج ذیل حدیث مبارکہ سے واضح ہے:

"عن يعلىٰ بن أمية قال قلت لعمر بن الخطاب "لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا" فقد أمن الناس فقال عجبت مما عجبت منه فسألت رسول الله عن ذٰلك فقال صدقة تصدّق الله بها عليكم فاقبلوا صدقته".[31]

"حضرت یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے "اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم نماز میں قصر کرو (یعنی چار رکعت فرض کی جگہ دو پڑھو) اگر تمہیں اندیشہ ہے کہ کافر تمہیں تکلیف میں مبتلا کر دیں گے" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے بھی اس بات پر تعجب ہوا تھا۔ میں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے (سفر میں تخفیف نماز کا) صدقہ کیا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کے صدقہ کو قبول کرو!

قرآن کریم کی آیت سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ قصر نماز کی رعایت ہے وجوب نہیں مگر مندرجہ بالا حدیث پاک سے واضح ہے کہ آپ ﷺ اور آپ کے اصحاب کا یہ طریقہ تھا کہ وہ سفر میں نماز قصر کیا کرتے تھے چاہے سفر پرامن ہوتا یا پُر خطر آپ ﷺ ہر حال میں نماز قصر کیا کرتے تھے۔ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے بعض مفسرین

نے یہ نقطہ نظر اختیار کیا ہے کہ آپ چاہیں تو نماز قصر کر لیں چاہے نہ کریں اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن احناف کا مؤقف یہ ہے کہ قصر نماز واجب ہے مستحب نہیں ذیل میں ہم مفسرین کی آراء کا جائزہ لیتے ہیں۔

### صاحب نجوم الفرقان کی رائے

صاحب نجوم الفرقان دوران سفر قصر نماز کے وجوب کے قائل ہیں جیسا کہ مندرجہ بالا حدیث مبارکہ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اسی حدیث پاک سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ (نماز) قصر کرنا واجب ہے کیونکہ حدیث شریف میں صدقہ کا معنی ہدیہ و تحفہ ہے، اللہ تعالیٰ نے جب ہدیہ عطاء فرمایا تو اسے نا قبول کرنا رب تعالیٰ کی نعمت سے رو گردانی ہے جو مؤمن کی شان کے لائق نہیں۔"[32]

### صاحب تدبر قرآن کی رائے

مولانا اصلاحی سفر میں قصر نماز کے وجوب کے قائل نہیں بلکہ وہ اسے اختیاری مسئلہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مسافر چاہے قصر کرے چاہے پوری پڑھے اسے اختیار ہے یہ کوئی وجوبی مسئلہ نہیں ہے جیسا کہ مندرجہ بالا آیت مبارکہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ " کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ قصر کی اجازت ایک قسم کی رخصت ہے رخصتوں کے متعلق سورہ بقرہ کی تفسیر میں، ایک مستقل فصل میں، ہم واضح کر چکے ہیں کہ ان سے فائدہ اٹھانے کو تقوی کے خلاف سمجھنا دین میں تشدد اور غلو کے رجحان کی غمازی کرتا ہے جس کو قرآن و حدیث دونوں میں مذموم ٹھرایا گیا ہے لیکن ساتھ یہ بات بھی غلو سے خالی نہیں قرار دی جا سکتی کہ کسی رخصت کو عزیمت اور وجوب کا درجہ دے دیا جائے یہاں تک کہ اس کی خلاف ورزی سے گناہ لازم آئے۔"[33]

### تقابلی جائزہ

مندرجہ بالا عبارتوں کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہے کہ قصر نماز میں تو کسی کو اختلاف نہیں کیونکہ یہ آیت قرآنی سے ثابت ہے البتہ اس کے حکم میں اختلاف ہے بعض اس کو رخصت پر محمول کرتے ہیں اور بعض کے نزدیک قصر کرنا واجب ہے۔ بھتر الوی کی تحقیق مندرجہ بالا آیت و حدیث کی روشنی میں یہ ہے کہ نماز کا قصر کرنا واجب ہے، جبکہ اصلاحی کی تحقیق یہ ہے کہ قصر کرنے کی اجازت ہے یہ واجب نہیں ہے یعنی مسافر چاہے تو چار رکعات والی نماز کو دو کر کے پڑھ لے چاہے مکمل پڑھے دونوں طرح جائز ہے شرعی لحاظ سے اس میں کسی قسم

کی کوئی قباحت نہیں ہے اصلاحی کے نزدیک جس طرح تعدد ازواج کی اجازت ہے یہ فرض نہیں کہ کوئی دو دو تین تین یا چار چار شادیاں کرے بالکل اسی طرح قصر نماز کا مسئلہ بھی اختیاری ہے چاہے کوئی قصر کرے یا نہ کرے یہ فرض نہیں ہے حالانکہ آپ ﷺ اور صحابہ کرام کے عمل سے واضح ہے کہ سفر میں قصر کرنا واجب ہے۔

### قصر نماز کے متعلق آپ ﷺ کا معمول

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"خرجنا مع النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم من المدینة إلی مكة فكان يصلی ركعتين ركعتين حتی رجعنا إلی المدينة قلت أقمتم بمكة شيئًا قال أقمنا بها عشرا"[34]

"ہم نبی کریم صلیٰ اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی طرف نکلے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو دو رکعتیں پڑھتے، یہاں تک کہ ہم مدینہ منورہ میں لوٹ آئے۔ میں نے کہا: آپ مکہ مکرمہ میں کچھ ٹھہرے؟ فرمایا: ہاں اس میں دس روز ٹھہرے۔"

### دیگر مفسرین کی آراء

**ابن کثیر کی رائے:** یہ تخفیف کمیت میں ہوگی یعنی چار کی بجائے دو رکعت، جیسا کہ جمہور علماء نے اس آیت سے اس کو سمجھا ہے اور اس سے سفر میں نماز قصر کرنے پر استدلال کیا ہے۔"[35] صاحب معارف القرآن کی رائے: "بعض لوگوں کو پوری نماز کی جگہ قصر پڑھنے میں دل میں گناہ کا وسوسہ پیدا ہوتا ہے، یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ قصر بھی شریعت کا حکم ہے جس کی تعمیل پر گناہ نہیں ہوتا بلکہ ثواب ملتا ہے۔"[36] صاحب تبیان القرآن کی رائے: اصل میں امر وجوب کے لئے آتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ سفر میں نماز کو قصر کرنا واجب ہے، سو اگر کسی نے دانستہ سفر میں پوری نماز پڑھی تو وہ گنہ گار ہوگا۔"[37] علامہ احمد یار خان نعیمی لکھتے ہیں: ساری امت کا اس پر اجماع ہے کہ سفر میں نماز کا قصر ہے یعنی چار رکعت فرض دو رکعت پڑھی جائیں گی اس میں اختلاف ہے کہ قصر جائز ہے یا واجب، ہم احناف کے ہاں قصر واجب ہے۔"[38] علامہ وھبۃ الزحیلی کی تحقیق: قصر واجب عزیمت ہے ہر چار رکعتی نماز میں دو رکعت مسافر کے لئے فرض ہے قصداً اس میں اضافہ کرنا نا جائز ہے۔"[39] صاحب کتاب الفقہ کی رائے: حنفیہّ تو کہتے ہیں کہ قصر کرنا واجب ہے اور واجب کا درجہ حنفیہّ کے نزدیک فرض سے کم اور سنت مؤکدہ کے برابر ہے لہٰذا مسافر کے لئے پوری نماز کا پڑھنا مکروہ ہے تاہم اگر پوری نماز پڑھ لی تو نماز صحیح ہو گی بشرطیکہ پہلا جلوس ترک نہ ہوا ہو۔"[40]

## راجح مؤقف

مندرجہ بالا تمام آراء کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ صاحب نجوم الفرقان کی رائے جمہور علماء کی آراء کے مطابق ہے جو قرآن وسنت کی روشنی میں زیادہ قوی ہے۔ آپ ﷺ اور آپ کے اصحاب کا یہی طریقہ تھا کہ وہ سفر میں قصر کیا کرتے تھے لہٰذا امت پر لازم ہے کہ شرع پاک کی طرف سے دی گئی سہولت کو قبول کرکے اس سے فائدہ حاصل کرے۔

## حضرت مریمؑ کو کیا رزق دیا گیا؟

قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

"فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ" [41]

"تو اسے اس کے رب نے اچھی طرح قبول کیا، اور اسے اچھا پروان چڑھایا، اور اسے زکریا کی نگہبانی میں دیا جب زکریا اس کے پاس اس کی نماز پڑھنے کی جگہ جاتے اس کے پاس نیا رزق پاتے، کہا اے مریمؑ یہ تیرے پاس کہاں سے آیا بولیں وہ اللہ کے پاس سے ہے بے شک اللّٰہ جسے چاہے بے گنتی دے۔"

مندرجہ بالا آیت مبارکہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر کیا ہے کہ وہ متقی اور پرہیز گار تھیں ہر وقت اپنے حجرے میں عبادت الٰہی میں مشغول رہتی تھیں۔ اللہ رب العزت کی طرف سے آپ کے پاس غیب سے رزق آتا تھا یہ آپ کی کرامت اور اللہ کے ہاں بلند مقام پانے کی علامت تھی۔ آپ کو اللہ کی طرف سے جو رزق دیا جاتا تھا جمہور مفسرین کی رائے یہ ہے کہ وہ حقیقی طور پر پھل وغیرہ ہوتے تھے جبکہ بعض کی رائے یہ ہے کہ یہاں پر رزق سے مراد روحانی فیوض وبرکات ہیں۔ ذیل میں بھترالوی اور اصلاحی کی آراء کا تقابلی جائزہ لیا جائے گا۔

## صاحب نجوم الفرقان کی رائے

صاحب نجوم الفرقان کی رائے یہ ہے کہ وہ حقیقی رزق تھا نہ کہ روحانی جیسا کہ آپ لکھتے ہیں:

"حضرت زکریا علیہ السلام جب ان کی عبادت کے کمرہ میں داخل ہوتے تو ان کے کمرہ میں بے موسم پھل پاتے گرمیوں کے پھل سردیوں میں اور سردیوں کے گرمیوں میں، تو بڑے تعجب سے پوچھتے اے مریمؑ یہ رزق تمہارے پاس کہاں سے آجاتا ہے، تو حضرت مریمؑ نے ان کے سوال کے جواب میں کہا اللہ تعالیٰ کے حضور سے مجھے یہ رزق ملتا ہے۔" [42]

آپ نے مزید اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اس چیز کی وضاحت کی ہے کہ حضرت مریمؑ عمر کے جس حصہ میں تھیں اس کے مطابق آپ کو کھانا پینا دیا جاتا تھا جیسا کہ آپ لکھتے ہیں : "راقم کے نزدیک عین ممکن یہ ہے کہ حضرت مریمؑ کو جنت کا دودھ اور شہد بھی میسر ہوتا ہوگا، کیونکہ آپ اس وقت دودھ پینے کی عمر میں تھیں، اسی وجہ سے رزقاً، کہا گیا طعاماً اور اکلاً نہیں کہا گیا۔"[43]

## صاحب تدبر قرآن کی رائے

علامہ اصلاحی کے نزدیک رزق سے مراد روحانی ترقی ہے نہ کہ کھانے پینے کی اشیاء روٹی، پھل اور دودھ وغیرہ جیسا کہ آپ لکھتے ہیں:

"رزق سے مراد یہاں حکمت و معرفت ہے۔ قرآن نے وحی و ہدایت کے لئے یہ لفظ ایک سے زیادہ مقامات میں استعمال کیا ہے۔ تورات اور انجیل میں بھی یہ تعبیر موجود ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا ارشاد مشہور ہے کہ آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمے سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔"[44]

## دونوں مفسرین کی آرا کا تقابلی جائزہ

دونوں مفسرین کی آراء کا تقابل کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ رزق کا معنٰی دونوں کے ہاں مختلف ہے بھترالوی اس سے مراد حقیقی رزق لیتے ہیں جبکہ اصلاحی اس سے مراد حکمت و معرفت لیتے ہیں جبکہ جمہور مفسرین اس سے مراد کھانے پینے کی چیزیں ہی لیتے ہیں جیسا کہ درج ذیل عبارات سے واضح ہے۔

## دیگر مفسرین کی آراء

ابن کثیر کی رائے "حضرت مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، ابو شعثہ، ابراہیم نخعی، ضحاک اور قتادہ وغیرھم فرماتے ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام جب مریم علیھا السلام کے پاس ان کے عبادت خانہ میں جاتے تو وہاں سردیوں میں گرمیوں کے پھل اور گرمیوں میں سردیوں کے پھل موجود پاتے۔"[45] معارف القرآن کی رائے: جب کبھی حضرت زکریا علیہ السلام ان کے پاس عمدہ مکان میں تشریف لاتے تو ان کے پاس کچھ کھانے پینے کی چیزیں پاتے اور یوں فرماتے کہ اے مریمؑ یہ چیزیں تمہارے واسطے کہاں سے آئیں وہ کہتیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آئیں۔"[46] صاحب تبیان القرآن کی رائے: "ضحاک بیان کرتے ہیں کہ حضرت زکریاؑ حضرت مریمؑ کے پاس سردیوں میں گرمیوں کے اور گرمیوں میں سردیوں کے پھل دیکھتے تھے۔ مجاہد نے بیان کیا ہے وہ ان کے پاس بے موسمی انگور دیکھتے تھے۔"[47] صاحب تفسیر ماہی کی رائے: حضرت زکریا علیہ السلام جب کبھی مریم علیھا السلام کے پاس ان کے حجرے میں جاتے تو بے موسمی میوے ان کے پاس پاتے مثلاً سردی میں گرمی کے پھل اور گرمی میں سردی کے پھل۔"[48]

## راجح مؤقف

مندرجہ بالا تمام مفسرین کی آراء کو دیکھا جائے تو یہ مسئلہ روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ تمام مفسرین نے رزق کی تفسیر میں یہی لکھا ہے کہ اس سے مراد حضرت مریمؑ کو ملنے والی جنتی نعمتیں اور موسمی و بے موسمی پھل تھے۔ابن کثیر نے اگرچہ یہ بیان کیا ہے کہ بعض مفسرین نے اس سے صحائف اور دینی احکام لئے ہیں لیکن ساتھ ہی اس کارد بھی کر دیا ہے کہ بے موسمی پھلوں کے حصول کی رائے زیادہ قوی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نیک بندی کو دنیا میں جنتی پھل عطاء فرمائے یہ حضرت مریمؑ کی کرامت و بزرگی کی واضح علامت ہے۔

## خلاصہ کلام

اس مضمون میں صاحب تدبر قرآن اور صاحب نجوم الفرقان کے مابین تفسیر میں اختلافی مباحث کے بارے میں جو بحث پیش کی گئی ہے اس میں جمہور مفسرین کی آراء کی روشنی میں مطالعہ سے واضح ہوا ہے کہ علامہ بھتر الوی کے مؤقف کو اسلاف کی تائید حاصل ہے۔ جبکہ مولانا اصلاحی کی رائے ہر مقام پر جمہور مفسرین سے مختلف ہے۔

*****

## حوالہ جات


1۔ محمد، 24:47

2۔ سید قاسم محمود، ص265

3۔ اصلاحی، تدبر قرآن، 7:1

4۔ ایضاً، 14:1

5۔ بھترالوی، 14:1

6۔ النساء 4: 80

7۔ بھترالوی، 105-106:1

8۔ اصلاحی، مبادیٔ تدبر قرآن، ص166-167

9۔ بھترالوی، 21:2

10۔ اصلاحی، تدبر قرآن، 83:1

11۔ایضاً
12۔ ایضاً، 82:1
13۔آل عمران، 7:3
14۔ مودودی، 49:1
15۔ مفتی، 1: 107
16۔ بھتر الوی، 27:2
17۔البقرہ، 125:2
18۔ بھتر الوی، 830:3
19۔ اصلاحی، تدبر قرآن، 329:1
20۔ابن کثیر، 270:1
21۔ مفتی، 322:1
22۔کیلانی، 105:1
23۔المائدہ، 31:5
24۔ بھتر الوی، 590:10
25۔ اصلاحی، تدبر قرآن، 500:2
26۔ابن کثیر، 82:2
27۔ مودودی، 463:1
28۔ پانی پتی، 444:3
29۔سعیدی، 157:3
30۔النساء، 101:4
31۔ النیسابوري، حدیث 686
32۔ بھتر الوی، 732/9
33۔ اصلاحی، تدبر قرآن، 2: 370-369
34۔ بخاری، حدیث 1081
35۔ابن کثیر، 762:1
36۔ مفتی، 534/2.

37۔ سعیدی، 779:2
38۔ نعیمی، 345:5
39۔ زحیلی، 790:1
40۔ الجزیری، 580:1
41۔ آل عمران 73:3
42۔ نجوم الفرقان، ج7، ص596، 2007ء
43۔ بھترالوی، 602:7
44۔ اصلاحی، تدبر قرآن، 78:2
45۔ ابن کثیر، 515:1
46۔ مفتی، 59 :2
47۔ طبری، 3: 165
48۔ چشتی، 59-60:2

## کتابیات


1. قرآن مجید
2. ابن کثیر، حافظ عماد الدین، تفسیر ابن کثیر: ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، 2009ء
3. اصلاحی، مولانا امین احسن، تدبر قرآن: فاران فاؤنڈیشن، طبع دوازدہم، لاہور، 2006ء
4. ۔۔۔، مبادئ تدبر قرآن، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، 2006ء
5. بھترالوی، عبد الرزاق، نجوم الفرقان من تفسیر آیات القرآن، مکتبہ احمد رضا کری روڑ، راولپنڈی، 2007ء
6. پانی پتی، قاضی محمد ثناء اللہ۔ تفسیر مظہری: ایچ، ایم سعید کمپنی، ادب منزل، کراچی
7. طبری، محمد بن جریر، تفسیر جامع البیان، دار المعرفہ بیروت، 1409ھ
8. الجزیری، عبد الرحمٰن، کتاب الفقہ (ترجمہ منظور احسن عباسی) پنجاب، علماء اکیڈمی، شعبہ مطبوعات محکمہ اوقاف، 2013ء
9. زحیلی، ڈاکٹر وہبہ، الفقہ الاسلامی وادلتہ (ترجمہ: مفتی ارشاد احمد): دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی
10. سعیدی، غلام رسول، تبیان القرآن: فرید بک سٹال، ۳۸ اردو بازار، لاہور
11. سید قاسم محمود، شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا: الفیصل، ناشران کتب، اردو بازار، لاہور، 2000ء

12. بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، باب ماجاء فی التقصیر وکم یقیم حتی یقصر
13. چشتی، خادم حسین، تفسیر ماہی: ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، 2010ء
14. کیلانی، عبدالرحمٰن، تیسیر القرآن لاہور: مکتبۃ السلام، وسن پورہ، 1431ھ
15. النیسابوری، مسلم بن حجاج، (م:۲۶۱ھ) صحیح مسلم، باب صلاۃ المسافرین وقصرہا، محقق: محمد فؤاد عبد الباقی، بیروت دار إحیاء التراث العربی
16. مفتی، محمد شفیع، معارف القرآن ادارۃ المعارف، کراچی
17. مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور
18. نعیمی، احمد یار خان، تفسیر نعیمی (لاہور: مکتبہ اسلامیہ ۴۰ اردو بازار

# اکبر شاہ کے دین الٰہی کی تشکیل کے بنیادی اہداف اور اثرات

# The Basic Goals & Effects of the Creation of Divine Religion by Akbar Shah

***Zulfqar Ali***


## *Abstract:*

*The Indian subcontinent has seen many examples of the peaceful coexistence of the followers of different religions. One of the most striking performances of this approach was the period of Jalal u din Muhammad Akbar-Shah. His tolerance created a new divine religion (Dine Ellahi) that played a major role in creating peace and unity among Indians and the flowering of the moughal Empire. Discussing the elements of divine religion of Akbar Shah is a fundamental issue that requires a comprehensive review and an independent study. According to this article, the creation of Dine Ellahi was carried out by Akbar Shah with the guidance of some ministers, scholars and judges of the court, including Shiites and Sunnis, for various reasons, and this group played a major role in the spread of divine religion. The basic question of this research paper is how and why many Hindues, Muslim and many other followers of all religions accepted this religion and played their role in the progress of their country. This article evaluates the reality and the most fundamental elements of Dine Ellahi of Akbar Shah from the historical point of view.*


***Key words:*** *Dine Ellahi, Akbar Shah, Religious Toleration, Islam, India.*

**کلیدی کلمات:** دین الہی، اکبر شاہ، مذہبی رواداری، اسلام، انڈیا۔

## تعارف

مختلف مذاہب کے پیروکاروں کا کسی ایک آئین کے ماتحت کامیاب زندگی گزارنا، تاریخ کے اہم ترین موضوعات میں سے ایک اہم موضوع ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں مختلف مذاہب اور مکابت فکر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے ایک دوسرے کے ساتھ پرسکون اور مذہبی رواداری سے سرشار زندگی گزارنے کا معروف ترین نمونہ سن 989ھ/ق میں جلال الدین محمد اکبر شاہ (دح1556-1605ء) کے دور حکومت میں دکھائی دیتا ہے۔ اکبر شاہ کی روادای اور اتحاد پسندی نے ہندوستان میں ایک نئے دین کو جنم دیا کہ جس کا بنیادی ہدف افراد معاشرہ کے مابین اتحاد کی فضا قائم

کرتے ہوئے ملک وملت کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا تھا۔ اکبر شاہ کے دین الٰہی کو تشکیل دینے والے عناصر اور عوامل کا تنقیدی جائزہ لینا اس لئے ضروری ہے کیونکہ اس دین کے تحت اکبر شاہ کے دور حکومت میں مختلف ادیان ومذاہب، او رمکاتب فکر کے حامل افراد متحد ہو گئے تھے۔ اس تحقیق کا بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ آخر ایسا کیونکر ممکن ہوا کہ ہندو اور مسلمان وغیرہ سب ایک دین کی اتباع کرتے ہوئے ملک وملت کی ترقی میں مشغول عمل رہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اکبر شاہ نے اپنے زمانے کے بعض شیعہ سنی علماء، وزراء اور کچھ دیگر درباری اہل علم افراد کے تعاون سے مختلف اہداف اور وجوہات کے پیش نظر دین الٰہی کو ایجاد کیا۔ اس مقالہ میں اس دین کی شناخت، اہداف، تشکیل کے مراحل، بنیادی عناصر وعوامل، اور اس کی معاشرہ پر تاثیر کو تاریخی نقطہ نظر سے بیان کیا گیا ہے۔

## اکبر بادشاہ کی شخصیت

اکبر شاہ ہندوستان کے مغلیہ بادشاہی خاندان کا تیسرا بڑا نام ہے جس نے ہمایوں (د. ح1507- 1556 میلادی) کی وفات کے بعد بیرام خان کی مدد اور معاونت سے 27 ربیع الاول 963ھ/ق بمطابق 1556ء کو 13 سال کی عمر میں ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی باگ دوڑ سنبھالی۔ پچاس سال پر مشتمل اس طولانی عرصہ میں اکبر شاہ نے مختلف مذاہب اور مکاتب کے علما اور فضلا سے متأثر ہو کر تمام ادیان کے مشترکہ نکات کو جمع کیا اور انہیں ایک دوسرے میں ادغام کرکے دین الٰہی کے عنوان سے ایک نیا مشترکہ دین متعارف کروایا۔ اکبر شاہ کے دور حکومت کے طولانی ہونے کی بنا بر دین الٰہی نے خوب پیشرفت اور ترقی کی اور ہندوستان میں اتحاد، امن اور رواداری کی فضاء قائم کرنے میں اس نے اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح اکبر شاہ دین الٰہی کے ذریعے ہندوستان میں مختلف مذاہب جیسے ہندو، مسلمان، عیسائی، سکھ، بدھ مت اور زرتشت وغیرہ کو ظاہراً متحد کرنے میں کافی حد تک کامیاب رہا اس بین المذاہب اتحاد نے اسلامی تہذیب اور دینی کلچر کو بڑی حد تک متأثر کیا۔[1]

ہندوستان کی سرزمین پر مختلف ادیان اور مکاتب کا وجود ایک قدیمی موضوع ہے کیونکہ یہ سرزمین آغاز ہی سے متفاوت اور متنوع حتی متضاد تہذیبوں، ثقافتوں، اور آداب ورسوم کا مرکز رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سرزمین پر طول تاریخ میں ہر طرح کے نظریات، عقاید مذہبی شعائر، ادیان، ہنر اور آداب ورسوم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ لہٰذا یہ سرزمین ہمیشہ سے مختلف ادیان ومذاہب کے حامل افراد کے لئے معاشرتی وحدت کا عملی نمونہ رہی ہے۔

اکبر شاہ نے اپنے دور حکومت میں تمام ادیان اور مذاہب کے درمیان اتحاد اور وحدت کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا تاکہ وہ اپنی حکومت کو مضبوط اور مستحکم بنا سکے۔ درحقیقت اکبر شاہ کا دربار ہر نئ فکر کے حامل شخص کے لئے ایک پناگاہ اور اس کے ابلاغ و اشاعت کا مرکز تھا۔ اکبر شاہ ادیان اور مذاہب کے درمیان اتحادی اور تلفیقی روش کے ذریعے تمام فرقوں بطور خاص مسلمان اور ہندو جو کہ اکثریت میں تھے کی کسی حد تک رضایت اور حمایت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور یہی بات اس کی تمام گروہوں کے درمیان محبوبیت اور شہرت کا سبب بنی۔ اکبر شاہ کا دور حکومت ہندوستان کی تاریخ کا سنہری دور شمار کیا جاتا ہے کہ جس میں تمام ادیان و مذاہب اور مکاتب فکر نے اپنے اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے ترقی کی منازل طے کیں۔ اس مقالہ میں دین الٰہی کی تعریف، توصیف، اہداف کے علاوہ اس کی تشکیل کے مراحل اور عوامل و عناصر کو بیان کیا گیا ہے کہ جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

1- اکبر شاہ اور اس کا عہد حکومت۔

2- دین الٰہی کی تعریف اور بنیادی اصول۔

3- دین الٰہی کی تشکیل کے مراحل۔

4- دین الٰہی کی تشکیل کے بنیادی عوامل اور عناصر۔

## 1-اکبر شاہ کا دور حکومت

جلال الدین محمد اکبر شاہ مغلیہ خاندان کا ہندوستان میں تیسرا حکمران تھا۔ نصر الدین ہمایوں نے اپنی جلاوطنی اور پناہ گزینی کے دوران ایک ایرانی خاتون بنام حمیدہ بانو بیگم سے شادی کی جس کے بطن سے 1542ء کو سندھ کے ایک تاریخی اور قدیمی قصبہ ٹھٹھ کے علاقہ بنام عمر کوٹ کے مقام پر جلال الدین محمد اکبر پیدا ہوا۔ اکبر کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری تکہ نامی ایک خاتون کے ذمے تھی۔[2]

اکبر شاہ کی ولادت کے وقت مغلیہ سلطنت بہت سارے بحرانوں کا شکار تھی۔ ایک طرف سے شیر خان (معروف بہ شیر شاہ سوری 1545م) نے افغانیوں، ترکوں، بلوچوں اور ہندوستانیوں کے مختلفر قبائل کو ساتھ ملا کر ہمایوں کا تختہ الٹ دیا تھا جبکہ دوسری طرف سے اس کے اپنو ں کی بیوفائی نے ہمایوں کو ناامید کر دیا تھا۔ ان حالات اور شرائط نے ہمایوں کو ایرانی بادشاہ طہماسب صفوی کے دربار میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ شیر شاہ کی وفات کے بعد ہمایوں نے ایرانی بادشاہ کی مدد سے قندھار، اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں کو فتح کیا اور پیش قدمی کرتے ہو

ئے دہلی اور آگرہ کا علاقہ بھی اپنی حکومت میں شامل کرلیا۔ نصیرالدین ہمایوں کی اچانک وفات کے بعد بیرام خان نے وزراء اور امراء سے باہمی مشاورت کے بعد اکبر شاہ کو کلانور کے مقام پر 27 ربیع الاول 963ھ/ق مساوی 1556ء کو مغلیہ سلطنت کا تاج پہنایا گیا۔[3]

اکبر شاہ سے پہلے مغلیہ سلطنت فقط دہلی اور پنجاب تک محدود تھی جبکہ بنگال، سندھ، گجرات، مالوہ، خاندیس کے علاقوں میں پٹھانوں کی حکومت تھی اسی طرح بعض علاقوں پر راجپوتوں نے اپنی مستقل اور علاقائی حکومت قائم کی ہوئی تھی۔ جب اکبر شاہ نے ہندوستان کی حکومت سنبھالی تو اس نے بہت سارے نئے احکام جاری کیے۔ کہ جن میں پرانے اور قدیمی جاگیرداری نظام کے بہت سارے اصول اور قواعد کو لغو کردیا اور ہندوستان کو مندرجہ ذیل (کابل، لاہور، ملتان، سرہند، دہلی، آگرہ، الہ آباد، اودہ، اجمیر، گجرات برار، خاندیس، احمد نگر، ہندوستان اور تین بنگال سے منسوب) 15 صوبوں میں تقسیم کردیا۔ ہر صوبے کی باگ دوڑ حاکم اور سپہ سالار کے پاس ہوتی تھی اور وہ اس کا مطلق العنان حکمران ہوتا تھا لیکن کے اس ساتھ ساتھ اس کے لئے مرکزی حکومت کا مکمل طور پر مطیع اور فرمانبردار ہونا بھی ضروری تھا انہی خصوصیات کی بناپر کہا جاتا ہے کہ اکبر شاہ کا دور حکومت ہندوستان کا سنہری دور تھا کہ جس میں تہذیب، ثقافت، ، ادبیات اور دین و مذاہب نے اس انداز میں ترقی اور پیشرفت کی کہ بعد میں آنیوالے ادوار کے لئے کسی حد تک نمونہ عمل قرار پائی۔

## 2-1-دین الٰہی کی تعریف اور بنیادی اصول واحکام

دین الٰہی کہ جسے بعض مؤلفین و مورخین نے ہندوستان میں صلح کلی کا نام دیا ہے اس سے مراد اکبر شاہ کے زمانے میں تمام ادیان اور مذاہب کا مساوی اور برابر ہونا تھا جس کی بنیاد جلال الدین محمد اکبر شاہ نے کچھ وزراء اور علماء کی مشاورت سے رکھی۔ صلح کلی سے مراد تمام ادیان اور مذاہب کا اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے امن واتحاد کی فضاء میں آزادانہ عمل کرنا تھا۔ یہ دین اکبر شاہ کی دینی اور اجتماعی سیاست سے مطابقت رکھتا تھا۔ اکبر شاہ نے تخت نشینی کے بعد اتحاد اور امن کی فضاء کو قائم کرنے کے لئے طاقت، مال و دولت، ذاتی اور معاشرتی روابط، افکار عمومی غرض یہ کہ ان تمام وسائل سے استفادہ کیا کہ جن سے وہ بحثیت بادشاہ مملکت کرسکتا تھا یہ سب سبب بنا کہ وہ اپنے زمانے میں اتحاد کا داعی اور مذہبی مصلح اور متفکر کے عنوان سے پہچانا جانے لگا۔ دراصل اکبر شاہ نے دین الٰہی کی تشکیل سے اپنے دینی اور اعتقادی نظریات کا واضح طور پر اظہار کردیا تھا۔ دین الٰہی کہ جس کی بنیاد تلفیقی اور دینی مشترکات پر رکھی گئی تھی اس وقت ہندوستان میں اکثر رائج ادیان کے لئے قابل قبول تھا۔

اکبر شاہ نے دین الٰہی کی بنیاد قومی، دینی اور مذہبی اتحاد پر رکھی تھی اس نے مشترکہ قوم وملت کی تشکیل کے لئے بہت ساری نئی اور جدید اجتماعی اور مشترکہ اصلاحات کو روشناس اور متعارف کروایا۔ جن میں سے قابل ذکر اصلاحات کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

۱. ہندوؤں کا جزیہ اور تغما جو اربوں روپوں کی مالیات پر مشتمل تھا، معاف کر دیا، ۲. مقدس مقامات اور زیارت گاہوں کی رقم معاف کر دی، ۳. ہندوستان میں رائج بلوغت سے قبل شادی کو ممنوع قرار دے دیا گیا، ۴. ستی کی رسم ( بیوہ کو شوہر کے ساتھ جلانا) ختم کرکے ہندو بیواؤں کو دوبارہ شادی کی قانونی ازجات دے دی گئی، ۵. حیوانات خاص کر گائے کو مخصوص ایام میں ذبح کرنے پر پابندی لگا دی، ۶. اور اسی طرح جنگی قیدیو ں کی سخت سزاؤں کا قانون محاکمہ بھی ممنوع قرار دے دیا گیا وغیرہ۔

بعض مؤلفین کے نزدیکٹ دین الٰہی رکچھ ایسی انسانی، اسلامی، مذہبی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار کا مجموعہ تھا جو ہندوستانی معاشرے میں اتحاد، امن اور بھائی چارے کی فضاء قائم کرنے میں مفید ثابت ہو سکتیں تھیں۔

ابوالفضل علامی نے دین الٰہی کی مہم ترین اصلاحات کو اپنی کتاب بنام "آئین اکبری" میں اس طرح ذکر کیا ہے:

دین الٰہی میں شہوت طلبی، جھوٹ، چوری، غیبت اور تہمت کو مذموم قرار دے دیا گیا تھا۔ اسی طرح تقویٰ، عقل گرایی، پرہیزگاری، محبت، انس، الفت اور مہربانی کو ممدوح کہا گیا، اس کے علاوہ اللہ کی رضا پہ راضی رہنا، اعتدال، انصاف، بزرگوں کا احترام، اندھی تقلید پر عقل کو ف وقیت دینا، عرفانی اور اخلاقی کتابوں کا مطالعہ، مشاورت، قسم نہ اٹھانا، گالی نہ دینا، غم اور غصہ پر قابو رکھنا، اولاامر یا پادشاہ کی اطاعتِ محض کا قائل ہونا، ذخیر اندوزی سے اجتناب کرنا، شراب کو بنانا، خریدنا اور بیچنا ممنوع وغیرہ وغیرہ کو، دین الٰہی کے بینادی اصولوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ نفس پرستی، غرور، ظلم، فریب، دنیاپرستی بھی مذموم اعمال شمار کیے جاتے تھے۔[4]

اگرچہ مناسک دینی کے لحاظ سے دین الٰہی توحید اور یکتاپرستی کا دعویٰ دار تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ سورج، چاند، آگ اور نور کو بھی مقدس جانا جاتا اور ان کی پوجا کی جاتی تھی کہ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سورج، چاند، آگ اور نور پرستی کے تصورات دین زرتشتی اور اسی طرح شمنی، ہندو اور اسلامی تصوف سے اخذ کیے گئے تھے۔[5]

یاد رہے کہ دین الٰہی نہ تو آسمانی دین تھا کہ جس کے ساتھ کتاب بھی اتری ہو اور نہ ہی کسی معروف دینی شخصیت نے اس کا تعارف کروایا تھا بلکہ یہ اکبر کے زمانے کے مروجہ تمام ادیان میں رائج مختلف عقاعد، آداب اور رسم و

رواج کا مجموعہ تھا کہ جس کا زیادہ تر حصہ اکبر شاہ کے دربار یا فتح پور سیکری میں موجود عبادت خانہ میں ہونے والے بحث و مباحثہ سے لیا گیا۔ ہوا یہ تھا کہ ان ابحاث سے اخذ شدہ نتائج نے اکبر شاہ کے دل میں کچھ اس طرح کی تاثیر ڈالی کہ جس کے نتیجے میں اس نے اس دین کو ایجاد کر ڈالا۔ اس طرح سے دین الٰہی کے اصول کسی مستقل دین کا پیش خیمہ نہیں تھے بلکہ یہ ہندوستان میں پائی جانے مذہبی ہم آہنگی کا نتیجہ تھا۔[6] اور یہی اکبر شاہ کی سیاست کا مرکز و محور تھا۔ دین الٰہی کا اصلی ترین ہدف تمام الٰہی یا غیر الٰہی ادیان اور مکاتب کے درمیان موجود اختلافات و منازعات کو ختم کرنا اور اتحاد و امن کی فضاء ایجاد کرنا تھا۔ تمام افراد کا ایک مشترک دین کے اصولوں پر عمل پیرا ہونا اور اس کے قوانین کی پابندی کرنا ضروری تھا۔

دین الٰہی کے بنیادی اور اساسی ترین اصول قرآن اور اسلامی اقدار سے ماخوذ تھے اور باقی مروجہ ادیان و مذاہب کی پسندیدہ اخلاقی و اجتماعی اقدار مثلاً تزکیہ نفس، قرب خدا، مراقبہ، محاسبہ۔۔۔ وغیرہ کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ اسی بنا پر دین الٰہی کے بیشتر اصول اسلامی اور اجتماعی اخلاق کی ترویج پر مبنی تھے۔ اکبر شاہ دین الٰہی کو دین توحید اور توحید الٰہی کے نام سے پکارتا تھا۔

اکبر شاہ کے اس اقدام پر علماء، مؤرخین اور اہل علم حضرات کا دو طرح سے رد عمل ہوا کہ جس میں ایک گروہ نے اس کے حق میں جبکہ دوسرے نے اس کے خلاف رائے دی. جنہوں نے اس کے حق میں رائے دی ان کے نزدیک اکبر شاہ ہندوستان کا مصلح، دانا، مہربان، شفیق اور کامیاب ترین حکمران تھا کہ جس نے علما اور ورزاء کی راہنمائی سے ہندوستان میں امن، اتحاد اور وحدت کی فضاء ایجاد کی جبکہ دوسرے گروہ نے اسے دین میں خرافات اور بدعات کی تشہیر گردانا ہے۔

بعض مورخین کے نزدیک دین الٰہی اکبر کے زمانے میں ایک سادہ اور قابل قبول نظریہ تھا جو مکانی اور زمانی شرائط کی بنا پر وجود میں لایا گیا۔ البتہ اسی زمانے میں اس کو بعض دیگر صاحبان علم و دانش کے ہاں ایک دینی بدعت بھی تصور کیا جاتا تھا یہاں تک کہ بعض افراد جیسے مؤرخ بدائونی، شاہ منصور، معصوم خان وغیرہ، کے نزدیک اس عمل کو اکبر شاہ کی پیغمبری یا پھر ربوبیت کے دعویٰ سے بھی متہم کیا جاتا رہا کہ جس کے سبب اس پر کفر والحاد کے فتوے لگائے گئے۔ جبکہ اکبر شاہ نے 1549ء میں شہر مکہ سے آنے والے خطوط کے جواب میں صاف لفظوں میں ان کے اس استدلال کو باطل قرار دیا اور دین الٰہی کو فقط اتحادِ مذاہب کا وسیلہ قرار دیا۔[7] اس کے علاوہ اکبر شاہ نے عبداللہ خان ازک حاکم قندہار کے خط کے جواب میں بھی اپنی پیغمبری و نیز الہیت کے دعویٰ کی مکمل اور واضح طور پر تکذیب کی۔ معلوم رہے کہ اکبر کے علاوہ جن لوگوں نے دین الٰہی کو ترویج دینے میں بنیادی کردادر ادا کیا انکی تعداد انتہائی مختصر یعنی ۱۹ افراد پر مشتمل تھی یہ افراد ایک زمانے تک اس دین کو وسعت

دینے اور ہندوستان کے کونے کونے میں پھیلانے کے لئے تگ و دو کرتے رہے لیکن اکبر کی وفات کے بعد اس کی ترویج کا عمل مکمل طور پر رک گیا کہ جس سے دین الٰہی کو زیادہ پذیرائی نہ مل سکی۔

## 3-1- دین الٰہی کی تشکیل کے مراحل

ہندوستان میں ہمیشہ دینی رواداری اور مشترک مذہبی فضاء غالب رہی ہے۔اکبر شاہ پہلا شخص نہیں تھا جس نے متحدہ ہندوستان کا خواب دیکھا تھا۔ اگرچہ ہندوستان میں اسلام کی آمد سے قبل کئی ادیان و مذاہب کے پیروکار باہم زندگی گذار رہے تھے اور جتنے مسلمان حکمران اس سرزمین میں داخل ہوئے انہیں اس صورت حال کا سامنا رہا اور تمام مسلم حکمرانوں کی خواہش رہی کہ اتحاد اور مسالمت آمیر فضاء قائم کی جائے، لیکن وہ اس دینی اور مذہبی اتحاد اور امن کو فقط سیاسی ضرورت تصور کیا کرتے تھے۔ مثلاًعلاء الدین خلجی نے جب 695ھ/ق میں دہلی میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی تو اس نے بھی مختلف مذاہب کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کے لئے کچھ اسی طرح کی کوششیں کیں۔اسی طرح تیمور لنگ نے سیاسی اہداف کے حصول کی خاطر خود کو سنی بلکہ متعصب سنی ظاہر کیا یہاں تک کہ اپنامذہب تبدیل کرڈالا۔ اس کے علاوہ مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر نے سنی ہونے کے باوجود ایران کے شیعہ مسلک بادشاہوں سے وفاداری کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ جتنی بھی اقوام، افغان، ترک، کرد، ایرانی، مغل، ازبک وغیرہ۔۔۔ ہندوستان میں داخل ہوئیں ہیں ان میں سے اکثر نے دینی اور مذہبی رواداری کا خیال رکھا ہے۔[8]

اکبر شاہ نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی اس میں مذہبی تعصب نہیں تھا۔اس کا خاندان تمام ادیان کااحترام کرتا اور ان کی دینی رسومات میں شریک ہوا کرتے تھے۔اس بناپر اکبر شاہ کے اندر بچپن ہی سے دینی روادای اور مذہبی ہم آہنگی کا جزبہ پایا جاتا تھا کہ جسے بعض سنی درباری علماء جیسے۔ عبد النبی، ابوالفضل علامی، ابوالفیض فیضی دکنی، محمد یزدی، لطیف قزوینی، شیخ عبدالنبی، حکیم ابوالفتح گیلانی وغیرہ نے صوفیانہ عقاید کا تابع بنادیا تھا۔اس کے ساتھ ساتھ دربار میں موجود کچھ شیعہ عناصر جیسے بیرام خان اور عبدالطیف قزوینی نے اکبر شاہ کے اندر مذہب شیعہ کے لئے نرم گوشہ پیدا کردیا تھا جبکہ وہ ذہنی طور پر روحانی، دینی، اجتماعی اور سیاسی اشتراک کا قائل ہوگیا تھا کہ۔جس کے نتیجہ میں اسے جب بھی فرصت ملتی اور حالات سازگار ہوتے تو وہ دینی اتحاد و مذہبی رواداری پر زور دیتااور اس کی ترویج کابندوبست کرتااکبر شاہ کے اس اقدام کو دین الٰہی کی تشکیل میں پہلا قدم تصور کیا جاسکتا ہے۔[9]

اکبر شاہ کے عہد حکومت میں دینی فضا کا غلبہ تھا اور لوگ بادشاہ کی نسبت دینی پیشواؤں اور رہنماؤں کی اطاعت کو ترجیح دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ بہت سارے نئے دینی اور مذہبی مکاتب نے بھی جنم لیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس ہرج و مرج کی فضاء سے بچنے کے لئے اس کے پاس بہترین راہ اور طریقہ دین الٰہی کی تشکیل تھا جس میں اس کے خیال سے وحدت و اتحاد کا عنصر پایا جاتا تھا۔ اکبر شاہ نے حکومت کی ابتدا ہی سے تمام مکاتب کو فکری اور مذہبی آزادی دے رکھی تھی جس کے نتیجے میں مختلف ادیان اور مکاتب فکر کے پیروکار، علما، اہل قلم، ہنر مند، دانشور، تجار، شعراء اور ادبا، ہمسایہ ممالک خاص کر ایران سے بڑی تعداد میں ہندوستان آنا شروع ہو گئے۔

تاکہ بادشاہ کو اپنے مدّنظر مذہب کی طرف مایل کر سکیں۔ اس طرح اکبر شاہ کا دار الخلافہ یعنی شہر آگرہ مختلف ادیان کی ایک دینی درس گاہ میں تبدیل ہو گیا جس میں تمام ادیان کو آزادی کے ساتھ اپنا نظریہ بیان کرنے کا موقعہ بھی ملا۔ اسلام کے علاوہ باقی ادیان خاص کر ہندو مذہب کو سمجھنے کے لئے، سنسکرت زبان اہل علم سکھائی گئی تاکہ وہ اس مذہب کے دینی اور ادبی آثار کو فارسی زبان میں ترجمہ کر سکیں البتہ اس کے علاوہ دوسری زبانوں جیسے عربی اور ترکی وغیرہ، میں موجود دینی اور ادبی مواد کو فارسی میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی جاتی رہی. یہ کام پہلے مرحلے میں ان کے نزدیک آزادی فکر کا موجب تھا اور اس کے علاوہ اکبر کے دین الٰہی کی راہ بھی ہموار کر رہا تھا۔[10]

اکبر شاہ نے 983ھ.ق کو فتح پور سیکری میں جو اس وقت ہندوستان کا دار الخلافہ تھا، دینی کتب کے مطالعہ اور مذہبی تعلیمات کے تجزیہ و تحلیل کی خاطر ایک عبادت خانہ تعمیر کروایا۔[11] ابتدا میں یہ عبادت خانہ صرف اہل تسنن کے ساتھ مختص تھا اور فقط اسلامیات والہیات پر مبنی موضوعات زیر بحث لائے جاتے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شیعہ مکتب فکر اور بعد میں باقی مذاہب مثلاً ہندو، زرتشت، آیین جین، سکھ بدھ مت، یہودی اور عیسائی حضرات کو بھی شرکت کی اجازت مل گئی ان جلسات میں جو حضرات مسلسل شریک ہوتے ان میں ابوالفضل مبارک علامی، شیخ جمالی بختیار، عبدالنبی، محمود پسی، مولانا شیرازی، ٹوڈر مال، بیر بل بھگوان داس، میرزا شاہرخ، راجہ بھگونت داس، اس عبادت خانے میں تمام حنفی، شافعی، شیعہ، فقہا، حکما اور دیگر مذاہب کے لوگ جمع ہوتے اور مذہبی اعتقادات اور دینی فلسفہ پر بحث و مباحثہ کرتے۔ مذکورہ عبادت خانہ میں رات کو خاص کر شب جمعہ تمام مکاتب کے افراد مختلف گروہوں کی نمایندگی کرتے ہوئے متفاوت موضوعات کو زیر بحث لاتے۔ اکبر شاہ بعض اوقات ان جلسوں میں خود بھی شریک ہوتا اور تمام حلقوں میں اس کی رائے کو ترجیح دی

جاتی حتی کہ بعض علماء جیسے ، صدر الصدور شیخ عبد النبی، قاضی جلال الدین ملتانی، صدر جہاں مفتی اعظم، شیخ مبارک ، غازی خان بدخشی، نے اکبر شاہ کو بطور مجتہد قبول کرلیا اور اس کو محضر نامہ کا نام دیا. اکبر کو مجتہد قرار دینے کا فتوای اس نے سورہ نساء کی آیت نمبر 59 کے پیش نظر دیا کہ جس میں ارشاد باری تعالی ہے: (يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۖ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا) (ترجمہ "اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے (اہلِ حق) صاحبانِ اَمر کی، پھر اگر کسی مسئلہ میں تم باہم اختلاف کرو تو اسے (حتمی فیصلہ کے لئے) اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو، (تو) یہی (تمہارے حق میں) بہتر اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔"
)[12] یہ اس صورت میں تھا کہ اکبر نے کسی دینی راہبریت کا دعوی نہیں کیا۔[13]

تمام ادیان کی اس تلفیقی اور اتحادی فضاء سے اکبر شاہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ توحید کی حقیقت کسی ایک دین میں مضمر نہیں اور نہ ہی کسی ایک فرقہ سے مختص ہے بلکہ اس کو تمام ادیان میں تلاش کرنا چاہیے۔ لہٰذا یہ وجہ بنی کہ اکبر دین الٰہی کی تشکیل کے لئے ذہنی طور تیار ہو گیا تھا۔[14]

## 1-4- دین الٰہی کی تشکیل کے عوامل و عناصر

اگر تاریخ کے تناظر میں دیکھا جائے تو ہندوستان میں مختلف ادیان ومذاہب کا وجود ہر حکومت کے لئے ایک بڑا مسئلہ رہا ہے۔ تمام حکومتوں کی طرح مغلیہ سلطنت کے سلاطین اور خاص کر اکبر شاہ نے بھی وہی راہ اختیار کی جو سیاسی طور پر مفید تھی۔ دین الٰہی کی تشکیل کا اصلی عامل خود اکبر شاہ تھا کہ جس کے دل میں موجود مذہبی اور دینی رواداری کا جزبہ شروع سے ہی پایا جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ اکبر شاہ نے ابتدا ہی سے یہ درک کر لیا تھا کہ ہندوستان میں موجود تمام ادیان کا اتحاد، اس کی سیاسی ضرورت ہے اس لئے اس نے اپنے ہدف تک پہنچنے کے لئے ہندوستان کے اصلی سردار خاندانوں یعنی ہندوؤں اور راجپوتوں سے بہتر اور قریبی تعلقات استوار کیے اور ان کے گھرانوں میں شادیاں کیں۔ اس طرح اکبر شاہ ان کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس عمل سے اس کی سیاسی قدرت میں بہت اضافہ ہو گیا۔

دوسرا بنیادی عامل جس نے دین الٰہی کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا وہ شاہی دربار اور اس کے ساتھ ساتھ اہم شہروں میں مختلف ادیان کی مذہبی اور دینی فعالیت تھی۔ اس دینی فعالیت نے نئے دین کی ایجاد کے سلسلے میں اکبر شاہ کی ذہنی آمادگی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ عہدِ اکبر میں مسلمانوں اور ہندوکے درمیان مسلسل تعاملات کی وجہ سے اسلام کی اشاعت اور ابلاغ کا انگیزہ ختم ہو چکا تھا۔ مذہبی اور فکری آزادی کی وجہ سے باقی ادیان کا اثر رسوخ بڑھ چکا تھا۔ لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ اکبر کے دین الٰہی میں نہ فقط اسلامی اصولوں کی خلاف ورزی کی گئی تھی بلکہ یہ دین اسلام وسعت کی راہ میں بہت بڑی روکاوٹ بھی تھا۔

البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شیعہ اور سنی متعصب علما کی گروپ بندیوں نے بھی دین الٰہی کی زمینہ سازی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس دوران اکبر شاہ بہت سارے دینی مشترکات کو درک کر چکا تھا۔ دربار میں موجود علما کے درمیان اختلاف اور تعصب نے اکبر شاہ کو اعتقادی طور کمزور کر دیا تھا اور اس بات نے اس کے اندر آزاد خیالی کو جنم دیا کہ جس کے سبب اکبر شاہ نے عقل و منطق کی روشنی میں غور و فکر کرنے ی کو اندھی تقلید پر ترجیح دینا شروع کر دیا جو دین الٰہی کی تشکیل میں ایک اور سنگ بنیاد ثابت ہوا۔[15]

ایک اور اہم عنصر کہ جس نے دین الٰہی کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا، وہ حکومت کی جانب سے مذہبی گروہوں کی اندرونی گروپ بندیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرنا تھا۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ اکبر شاہ کے دور حکومت میں بہت ساری تحریکوں نے جنم لیا اور لوگ بادشاہ کی نسبت دینی راہبرون سے زیادہ وفادار ہونے لگے۔ اکبر شاہ نے ان دھڑے بندیوں کو ختم کرنے کے لئے بھی دین الٰہی کا انتخاب کیا تاکہ مرکزی حکومت کو مضبوط کیا جاسکے۔ اکبر شاہ کے ان اقدام سے تمام ادیان کی خود محوری ختم ہو گئی جس سے مرکزی حکومت کو استحکام ملا۔ ی۔

ہندواور باقی ادیان کی رضایت اور حمایت کے حصول نے دینی رواداری کی فضاء قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اکبر شاہ کے دور حکومت تک بہت سارے راجپوت تسلیم نہیں ہوئے تھے۔ یہ قبایل تعداد میں زیادہ ہونے کے علاوہ جنگجو، بہادر اور ہندوستان کی سرزمین سے خوب واقف تھے۔ اکبر شاہ کی نصف فوج ان افراد پر مشتمل تھی۔ اس کے علاوہ بہت سارے اداری اور مالی معاملات کی مسوئلیت ان کے پاس تھی۔ جلبِ حمایت کے علاوہ اکبر کا اہم ترین ہدف دربار میں ایرانی اور تورانی اشرافی طبقہ کی قدرت کو ختم کرنا بھی تھا اور اکبر اس ہدف کے حصول میں بھی دین الٰہی کے ذریعے کافی حد تک کامیاب رہا۔[16]

اکبر شاہ کے دور حکومت میں تصوف کا عروج تھا اس لئے صوفیا کرام نے عوام میں اور خاص کر ہندوؤں، زمینداروں، جاگیرداروں، تجار اور شعرا کے درمیان مذہبی رواداری اور دینی بھائی چارے کو بہت فروغ دیا جو دین الٰہی کی تشکیل میں ایک اور اہم سنگ بنیاد ثابت ہوا۔ صوفیا اور اولیا کرام نے عوام کو مشترک دین کے لئے ذہنی طور پر آمادہ کر دیا تھا۔ اس بنا پر صوفیاء اور اولیاء اکرام کا بھی دین الٰہی کی تشکیل میں اہم کردار سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

مختلف ادیان اور مذاہب کے حامل اہل علم حضرات کا ہندوستان کی طرف ہجرت کرنا بھی، دین الٰہی کی ایجاد میں اہم سبب ثابت ہوا۔ مختلف افکار کے حامل افراد نے بلا تفریق تمام دینی اور مذہبی اقدار کا احترام کیا اور خاص کر سلسلۂ چشتیہ کو بہت زیادہ پذیرائی ملی۔ خود اکبر شاہ بھی سلیم چشتی کا معتقد تھا اور اس سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔[17]

مغلیہ سلطنت کا دینی جواز بھی دین الٰہی کی تشکیل کا سبب تصور کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس دور میں تمام ہمسایہ ممالک مثلاً ایران میں صفوی بادشاہ نے شیعہ مذہبِ کو رسمی قرار دے دیا تھا اسی طرح سے ترکی میں خلافت عثمانی سنی مذہب کی دعویدار تھی۔ اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ صفوی اور عثمانی دونوں ہمسایوں کا مذہبی اعتبار سے اس قدر شدت پسند ہونا اس بات کا امکان قوی ہے کہ اکبر نے مغلیہ سلطنت کی مشروعیت یا دینی جواز کے لئے دین الٰہی کی بنیاد رکھی جو اس کی نظر میں تمام مکاتب فکر کا متفقہ دین تھا۔

## دین الٰہی کی تشکیل کے بنیادی اہداف اور ہندوستان پر اس کے اثرات

اگرچہ مذکورہ بالا سطور میں بہت سارے مقامات پر دین الٰہی کی تشکیل کے بعض اہداف کو اشارتاً پیش کیا گیا ہے لیکن اس مقام پر کچھ وہ اہداف بیان کرنا مطلوب ہیں کہ جن کا ذکر کرنا باقی ہے۔ اس طرح سے دین الٰہی کا بنیادی ترین ہدف ہندوستانی معاشرے میں دینی اور مذہبی اشتراک اور متحدہ ہندوستان کے اس خواب کی تعبیر تھا کہ جسے ہر حکمران نے اپنی آنکھوں میں سجا رکھا تھا۔ بااکبر شاہ کی، قومی، دینی اور مذہبی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ ایک ملی اتحاد قائم کرے۔ اکبر شاہ نے اپنے طولانی ترین دور حکومت میں اس بات کو خوب درک کر لیا تھا کہ مغلیہ سلطنت و حکومت کی پائداری اور بقا تمام مکاتب فکر کو ملا کر چلنے میں پنہان ہے۔ دین الٰہی کی تشکیل اکبر شاہ کی سیاسی ضرورت تھی اور مغلیہ سلطنت کا استحکام اور مذہبی رواداری کا قیام اس کے اہم ترین اہداف میں شامل تھے۔[18]

دین الٰہی کی تشکیل کا ایک اہم ہدف تمام مذاہب کے حامل افراد کی حمایت اور رضایت کا حصول تھا ۔ اکبر شاہ اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ ہندوستان کی ترقی اور مغلیہ سلطنت کا استحکام تمام مکاتب فکر اور قوموں قبیلوں کو ملا کر چلنے میں ہے۔ اس نے اس ملی اتحاد کی ترویج کے لئے جہاں ایک طرف سے علماء اور دانشوروں کی خدمات حاصل کیں وہاں پر مختلف مذاہب و قبائل جیسے، مسلمان، ہندو، راجپوت، مسیح، یہودی وغیرہ خاندانوں میں شادیاں کیں۔ اس طرح اکبر شاہ کو ہندوستان کے اکثر مذاہب و قبائل کی وفاداری کا یقین ہو گیا کہ جس کے نتیجہ میں ہر گروہ کو دربار تک رسائی حاصل ہو گئی۔ علاوہ ازیں اس نے تغما، جزیہ اور کروڑوں کی مالیات حذف کر دیں اور دربار میں بڑے بڑے مناصب و مقامات عطا کیے کہ جس کے نتیجہ میں دینی اور مذہبی رواداری اور تحمل کو فروغ ملا۔[19]

دین الٰہی کی تشکیل اور ترویج کا ایک اہم ہدف غیر ضروری اور غیر منطقی رسوم کا خاتمہ بھی تھا جس کہ گذشتہ ابحاث میں اشارہ کیا ہے کہ ہندوستان کا تمدن اور فرہنگ مختلف عناصر کا مجموعہ تھی کہ۔ جس میں ہر طرح کی طرز زندگی کو قریب سے مشاہدہ کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح اکبر شاہ بہت ساری غیر عقلی رسوم مثلاً ستی، سادووں کا ننگا رہنا، خواتین پر ظلم اور ان کے حقوق کا خیال نہ رکھنا، شکنجہ اور محاکمہ کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہوا۔[20]

سنت گرائی کا خاتمہ اور عقل گرائی کو ترویج دینا دین الٰہی کی تشکیل کا ایک اور اہم ہدف تصور کیا جا سکتا ہے کیونکہ اکبر شاہ دربار کی متعصب فضاء سے مایوس ہو چکا تھا۔ دراصل درک کر چکا تھا کہ توحید کی حقیقت کسی ایک فرقہ سے مختص نہیں کی جا سکتی۔ اسی بنیاد پر اکبر شاہ نے تمام مکاتب فکر کے لئے عبادت خانہ کے دروازہ کھول دیے اور تمام مذاہب کو اپنے عقاید کا پرچار اور تبین واشاعت کا پوار حق حاصل تھا۔ دین الٰہی، اس طرح مذہبی گروپ بندیوں کو کافی حد تک ختم کرنے میں کامیاب رہا۔ دراصل اس مذہب کا مقصد، تمام مذاہب والوں کو یکجا کرنا اور، ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ اکبر کے مطابق، دین ہندو، دین مسیحی، سکھ مذہب، دین اسلام اور زرتشت وغیرہ کے، عمدہ اور خالص اُصولوں کو اکھٹا کر کے ایک نیا دینی تصور قائم کرنا، جس سے رعایا میں نااتفاقیاں دور ہوں اور، بھائی چارگی قائم ہو۔ ہندوستانی معاشرہ کی طبقاتی تقسیم کا خاتمہ بھی دین الٰہی کے اہداف میں شامل تھا۔ جیسا کہ گذشتہ ابحاث میں اشارہ کیا تھا کہ ہندوستان ہمیشہ سے مختلف ادیان و مذاہب کا مجموعہ رہا ہے تو اس صورت حال میں معاشرتی طبقہ بندی بھی اس سرزمین پر میں موجود رہی ہے خاص کر ہندوؤں میں ذات پات اور طبقہ بندی کا رجحان بہت زیادہ تھا

جو دینی رواداری اور بھائی چارہ کے خلاف تھا۔ اکبر شاہ تمام طبقات کے درمیان بلا تفریق مساوات، برابری اور دینی رواداری کو فروغ دینے کا خواہشمند تھا لہٰذا اس کے نزدیک اس کا بہترین راستہ دین الٰہی کی تشکیل تھا جو ہندوستان میں رائج تمام ادیان کے بعض ٹکڑوں اور حصوں پر مشتمل تھا۔

## 2-2- ہندوستان کے معاشرے پر دین الٰہی کے اثرات

دین الٰہی جو کہ اکبر شاہ اور اس کے ساتھ دیگر علماء و فضلاء خاص کر شیخ ابوالفضل علامی، شیخ ابوالفیض فیضی، بیرام خان وغیرہ کی مشاورت، راہنمائی اور مختلف ادیان کی مشترکہ اقدار سے وجود میں آیا اس نے مختصر وقت میں ہندوستانی معاشرہ پر بہت سارے دیرپا اثرات مرتب کیے جن میں سے اہم ترین نقوش مندرجہ ذیل ہیں:

سب سے پہلی چیز جو اس موضوع پر دیکھنے کو ملتی ہے وہ یہ کہ دین الٰہی کی تشکیل سے بعض افراد کے نزدیک مذاہب کے احترام کو فروغ ملا اور مخصوص دین محوری اور دینی برتری کا خاتمہ ہوا۔

اکبر شاہ نے دین الٰہی کے باقاعدہ اعلان سے قبل مختلف زبانوں میں موجود متفاوت ادیان کے دینی، ادبی اور تاریخی آثار

کو اس زمانے کی مروجہ زبان فارسی میں ترجمہ کروایا۔ اس طرح عوام کو مختلف ادیان سے آشنائی کا موقعہ ملا جس سے عوام کے اندر دین شناسی کو بہت فروغ ملا حتی کہ انہیں اپنے دین کو سمجھنے میں بھی کافی حد تک مدد ملی۔

دین الٰہی نے ہمسایہ ممالک خاص کر ایران، پرتغال، خلافت عثمانیہ ی اور بنگال سے، اقتصادی، تجاری، ادبی فرہنگی روابط کے فروغ میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ جیساکہ تاریخی شواہد سے یہ بات عیاں ہے کہ تمام ہمسایہ ممالک سے اکبر شاہ کے دور حکومت میں برادرانہ تعلقات قائم تھے۔ کہ جس کے نتیجے میں سمندری اور زمینی راستوں ہ سے تجارت کو بہت فروغ ملا۔

اگرچہ بعض افراد اس دین کے سبب وجود میں آنے والی بدعات اور اختلافات کے قائل ہیں جبکہ ایک دوسرا گروہ اس بات کا معتقد ہے کہ دین الٰہی نے عوام اور علماء کے درمیان فاصلے کو کافی حد تک کم کر دیا تھا کیونکہ ہر فرقہ کے عالم دین کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اپنے دین کے پیروکاروں کو مذہبی حقانیت بیان کرے تاکہ گمراہی کا امکان کم ہو۔ البتہ متدین علما عوام کو دین الٰہی کے مفاسد ہی بیان کرتے۔ اس کے علاوہ دین الٰہی کہ جسے انہوں نے صلح کلی کا

نام دے رکھا تھا، دربار اور عوام کے درمیان بھی پائے جانے والے فاصلوں کو کم کرنے میں بھی مفید ثابت ہوا۔ بعض مورخین کے نزدیک اکبر شاہ ہفتہ میں تین دن عوامی عدالت اور ایک دن خاص دربار منعقد کیا کرتا کہ جس میں خود شریک ہوا کرتا تھا۔[21]

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دین الٰہی کے ذریعے مختلف افکار کے حامل افراد کو دوسرے ادیان کے بارے میں جب مثبت آگاہی ملی تو اس سے مختلف مکاتب فکر کے درمیان صلح اور آشتی کی فضا برقرار ہوئی. کیونکہ اس وقت لوگ اپنے دین کے علاوہ دیگر ادیان کے بارے میں کافی حدتک آشنایی رکھنے لگ گئے تھے کہ جس سے وہ ایک دوسرے کوں احترام کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

دین کی تشکیل نے مغل، ترک، ایرانی، راجپوت، زمیندار، جاگیر دار اور امراء وغیرہ کی خود سرائی، ظلم، ناانصافی اور عوامی معاملات میں بغیر کسی وجہ کے دخل اندازی کو کافی حدتک کم کر دیا۔ یہ بھی تاریخی مصادر میں ملتا ہے کہ دین الٰہی میں مزدور طبقہ کے حقوق پر بہت زور دیا گیا تھا۔ اور مذہبی فضاء اور دینی رواداری سے دربار میں موجود اشرافیت کا کافی حدتک خاتمہ ہو گیا۔

دین الٰہی کی ان ساری خوبیوں اور خامیوں کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ اکبر شاہ کو ایک مسلمان بادشاہ کی حیثیت سے کسی بھی صورت میں اس بات کی اجازت نہیں دی گئی تھی کہ وہ اپنے سیاسی اور سماجی مسائل کے حل یا پھر مادی ترقی کی غرض سے کسی نئے دین کا آغاز کرے کہ جس میں اسلامی قوانین جیسے گائے کو ذبح کرنے پر پابندی لگانا، غیر کتاب کفار کے ساتھ ایک ظرف میں غذا کھانا یا ان کو مسلمان کئے بغیر ان سے رشتہ داری قائم کرنا وغیرہ وغیرہ، کو تبدیل کرکے دین اسلام میں بدعات کا آغاز کرے۔ البتہ ملکی ترقی اور پیشرفت کے پیش نظر اگر ایک ملی اتحاد بنا دیا گیا ہوتا کہ جس میں ہر دین کے پیروکاروں کو اپنے اپنے عقاید اور تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے کا موقع دیا جاتا اور کسی بھی دین خصوصاً دین اسلام کے حلال یا حرام کردہ قوانین میں رد و بدل نہ کی جاتی تو یہ بات کسی حدتک قابل قبول تھی لیکن اکبر شاہ دین الہی کی تشکیل کی ذریعے دین میں بدعات ایجاد کرنے کا واضح طور پر مرتکب ہوا تھا۔

## نتیجہ

اکبر شاہ کا ذاتی رجحان، سیاسی اہداف، دربار میں موجود مختلف عناصر کا وجود، اور ہندوستان کی خاص زمانی اور مکانی شرائط دین الٰہی کی تشکیل کے بنیادی ترین عوامل اور عناصر تھے۔ درحقیقت دین الٰہی اکبر کے زمانے، ہندوستان میں مروجہ تمام ادیان اور مذاہب کا امتزاج اور مجموعہ تھا۔ دین الٰہی کو اکبر شاہ نے تمام مکاتب فکر کے درباری علماء کی راہنمائی سے، معاشرہ میں اجتماعی، دینی، مذہبی وحدت، تقویٰ، پرہیزکاری، عقل کو اندھی تقلید پر برتری، مذہبی تبعیض کا خاتمہ، عدل وانصاف کا قیام اور تمام طبقات کے درمیان مساوات وبرابری کو قائم رکھنے کے لئے ایجاد کیا تھا۔ البتہ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ دین الٰہی اکبر شاہ کی سیاسی ضرورت تھا۔

اکبر شاہ نے دین الٰہی کے ضمن میں اپنی خدائی یا پیغمبری کا دعوی نہیں کیا البتہ بعض لوگوں نے اس حوالے سے اس پر یہ تہمت لگائی جو اختلاف کا سبب بنی۔ اکبر شاہ کا دین الٰہی کی تشکیل کا اصلی ترین ہدف ہندوستان میں صلح کل یا دینی رواداری، امن، اتحاد، کو رواج دینا تھا ۔ اکبر شاہ دراصل دین الٰہی کے ذریعہ متحدہ ہندوستان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتا تھا۔

اکبر شاہ کو دین الٰہی کی تشکیل پر بہت سارے اختلاف کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس نے کسی کی نہ سنی اور مسلسل کوشش کے بعد مقرر کردہ اہداف کے حصول میں کافی حدتک کامیاب رہا لیکن اس دین کو زیادہ پذیرائی نصیب نہ ہوئی اور اس کے پیروکاروں کی تعداد بہت کم تھی کہ جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مختلف ادیان و مذاہب کے پیشوا اور عوام اس دین کو نہ فقط نہیں مانتے تھے بلکہ اس کے مخالفت تھے۔

*****

## حوالہ جات

1۔ صفوی، ص1

2۔ اتکہ ہمایوں کے ایک وفادار دوست ندیم خان کی بیوی تھی ۔ اکبر اس کو ماں کہہ کر پکارتا اور اس کا بہت زیادہ احترام کیا کرتا تھا

3۔بدائنی، ص386۔ حسن بیگ روملو، احسن التواریخ میں لکھتا ہے جیسا کہ اکبر شاہ نے آگرہ میں بادشاہی کا تاج پہنا، اسی طرح حکیم میرزا اکبر شاہ بہائی نے بھی کابل میں اپنی حکومت کا اعلان کیا

4۔علامی، 278:3

5۔کلود فریزر، ص40و47

6-Athar, p 162

7 -koka—Aziz, p5

8۔حکمت، ص123

9۔پناہی، ص 7

10۔حکمت، ص114

11۔احمد، محمد سعید، آثار اکبری یا تاریخ فتح پور سیکری، آگرہ، انتشارات اکبری، 1324ش

12۔بدایونی، 138:2

13-ایضاً، ص246

14۔احمد، نظام الدین، 127:2

15۔بدایونی، 228:2

16۔ محمد علی، ص256

17۔علامی، ابوالفضل، اکبر نامہ، تہران انتشارات مؤسسۂ مطالعات تحقیقات فرہنگی، 1372ش

18- شیمل، ص92

19۔آزاد، ص87

20۔فرزانہ لطفی و صادق اشکوری، مجموعہ مقالات میراث مشترک ایران و ہند، قم انتشارات مجمع ذخائر اسلامی، 1394ش

21۔ریاض السلام، ص121

## کتابیات


1. احمد، نظام الدین، طبقات اکبری، کلکتہ، انتشارات مولوی ہدایت حسین، 1931ء
2. احمد، محمد سعید، آثار اکبری یا تاریخ فتح پور سیکری، آگرہ، انتشارات اکبری، 1324ش
3. آزاد، محمد حسین، دربار اکبری، دہلی، 2010ء
4. بدائنی، عبدالقادر، ترجمہ، فاروقی احمد، منتخب التوریخ، انتشارات لاہور اردو بازاا نار کلی، 1874ء
5. پناہی، یعقوب، تبیین تسامح مذہبی در بستر حکمرانی اکبر شاہ، فصلنامہ دانشگاہ بہشتی، بہار خرداد ماہ، شمارہ 5، 1391ش

6. حکمت، اصغر علی، سرزمین ہند، تہران، انتشارات دانشگاه تہران، 1337ش
7. ریاض السلام، تاریخ روابط ایران وہند، مترجم عباسقلی غفاری فرد و محمد باقر آرام، تہران، انتشارات امیر کبیر، 1373ش
8. شیمل، آنہ ماری، در قلمرو مغل، ترجمہ، سمیعی فراز نجد، تہران انتشارات امیر کبیر، 1386ش
9. صفوی، آذرمیدخت، مجموعہ مقالات زبان وادبیات فارسی در زمان اکبر شاہ وسلاطین صفوی، ہند، مرکز تحقیقات زبان فارسی دانشگاہ علیگرہ، 1395ش
10. علامی، ابوالفضل، آئین اکبری، ، تہران انتشارات مؤسسۂ مطالعات تحقیقات فرہنگی، 1877ء
11. فرزانہ لطفی و صادق اشکوری، مجموعہ مقالات میراث مشترک ایران وہند، قم انتشارات مجمع ذخائر اسلامی، 1394ش
12. کلود فریزر، دولافوس، تاریخ ہند، ترجمہ، محمد تقی فخر داعی، تہران، انتشارات آثار مفاخر فرہنگی 1316ش
13. محمد سعید احمد، آثار اکبری یا تاریخ فتح پور سیکری، آگرہ، انتشارات اکبری، 1324ش
14. محمد علی، نگاہی دو بارہ بہ وضعیت کشور ہند، مجموعہ مقالات، تہران انتشارات مہر تابان، 1390ش
15. Athar, M. Ali, Mughal in India, oxford press 2014ad
16. koka—Aziz, king collection_ Cambeidge university library, 1594ad
17. - Vincent, A, Smith, Akbar the Great Mogul Oxford Clar endon press1917
18. -The Dabistan or School of Manners, David Shea and Anthony, london1843

# امت واحدہ کا قرآنی تصور

## *The Quranic Concept of “Ummat-E-Wahida”*

***Asghar Askari***


### *Abstract:*

*An attempt has been made in this article to show what is meant by the Quranic concept of “Ummat-e-Wahida”? In fact, there is no scholarly consensus with regard to the concept. Some scholars have taken it as a reference to human unity as against those who have seen it as an alternative term for Muslim community. Some others have defined it as a religion. The author has presented views of different exegetists regarding the term. The quranic terms of “ummat-e-Wahida” and “ummat-e-Wasat” have been also taken into account to see whether they refer to a single reality or different distinct realities. For the author, all the phrases in the Quran containing the term ummah refer to a single reality. Different practical ways of unity among Muslims have been also debated in this article. State and religious leadership may play crucial role in creating unity.*


***Key words:*** *Holy Qurarn, ummat-e-Wahida, Commonalities, Practical unity, Ummat-e-Wasat.*

**کلیدی کلمات:** قرآن، امت واحدہ، مشترکات، عملی وحدت، امت وسط۔

**تعارف**

اس مقالے میں یہ امر اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن نے امتِ واحدہ کے متعلق کیا تصور دیا ہے اور اس سے کیا مراد ہے؟ دراصل، امتِ واحدہ کے متعلق تعبیرات اور تشریحات میں اختلاف ہے۔ بعض نے اس سے انسان کی وحدت مراد لی ہے۔ بعض نے اس سے امتِ مسلمہ مراد لیا ہے اور بعض نے امت واحدہ سے ایک دین مراد لیا ہے۔اس مقالہ میں امتِ واحدہ کے بارے میں مختلف مفسرین کا نکتہ نظر پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے مرحلے میں یہ دیکھا گیا ہے کہ قرآن نے "امت واحدہ" اور "امتِ وسط" کی جو تعبیرات استعمال کی ہیں آیا ان سے مراد کوئی ایک حقیقت ہے اور یہ تعبیرات مختلف ہیں؟ یا یہ تعبیریں مختلف حقائق کی نشاندہی کرتی ہیں؟ مقالہ نگار نے اپنے مقالے

میں یہ واضح کیاہے کہ قرآن میں جو امت کی مختلف تعبیریں بیان ہوئی ہیں وہ اصل میں ایک ہی حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ مقالہ کے آخر میں یہ امر زیر بحث لایا گیاہے کہ اتحاد وحدت کے ممکنہ عملی راستے کون سے ہیں؟ اس حوالے سے مقالہ نگار کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ اگر ریاستی ادارے اور دینی قیادت اتحاد ووحدت ایجاد کرنے میں سنجیدہ ہوں تو اس کاحصول انتہائی آسان ہے۔اسی طرح ایسے تعلیمی اداروں کا قیام بھی امت کی وحدت کے تحقق کاموجب بن سکتاہے جہاں تمام مسالک کے طلبہ ایک فضامیں تعلیم حاصل کریں۔

## قرآن کی جامعیت

قرآن نے انسان کو زندگی گذارنے کے جو اصول بتائے ہیں اس پر عمل پیرا ہو کر جہاں انسان اپنی آخرت سنوار سکتاہے وہاں اپنی دنیا کو بھی جنت نظیر بنا سکتاہے۔قرآن کے اعجاز کے جہاں دیگر مختلف پہلو ہیں، وہاں ایک اہم پہلو یہ ہے کہ قیامت تک آنے والے انسان اس الٰہی کتاب میں غور وفکر کرتے ہوئے نت نئے مطالب اخذ کرتے رہیں گے اور یوں قرآن قیامت تک بشریت کی ہدایت کا عمل جاری رکھے گا۔قرآن نے امت واحدہ کا جو تصور دیا ہے کچھ سال قبل شاید ہم اس کی اہمیت کاادراک نہیں کر پارہے تھے مگر جیسے دنیا سمٹتی چلی جارہی ہے، فاصلے کم ہوتے جا رہے ہیں اور دنیاایک گلوبل ولج (Global Village) کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے، قرآن کے امت واحدہ کے تصور کی ضرورت کھل کر سامنے آتی جارہی ہے۔آج مختلف ادیان ومذاہب کے پیروکار یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ اگر تمام ادیان ومذاہب کا سرچشمہ خدا اور وحی الٰہی ہے تو پھر ادیان و مذاہب کے درمیان اتنا اختلاف کیوں ہے اور اتنی نفرت اور دوریاں کیوں ہیں؟ جبکہ نہ آسمانی کتابوں میں اختلاف ہونا چاہئے اور نہ خداکے بھیجے ہوئے پیغمبروں کے پیغام میں اختلاف کوئی معنی رکھتاہے۔ان سب کاسرچشمہ اور منبع ایک ہی ذات ہے جس میں کسی قسم کانقص وعیب نہیں ہے۔جو کمالات کا مجموعہ ہے۔پس اس کی نازل کردہ کتابوں اور اس بھیجے گئے پیغمبروں میں بھی کہیں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔

پس ادیان ومذاہب کی یہ تصویر جو آج دنیاکاانسان پیش کر رہا ہے جس میں تعصب ہے، تکفیر ہے، نفرت ہے، اپنے کو حق اور دوسرے کو باطل سمجھنا ہے توکیادین و مذہب کی حقیقت یہی ہے؟ یا ایسانہیں ہے بلکہ یہ توادیان ومذاہب کی ایسی تشریحات ہیں جو حقیقی دین سے مطابقت نہیں رکھتی جو کہ امن و سلامتی کا دین ہے۔یہ وہ سوالات ہیں جس کی وجہ سے ہم نے قرآن سے راہنمائی لینے کی کوشش کی ہے کہ قرآن کاان ادیان ومذہب کے بارے میں کیانکتہ نظرہے اور قرآن نے امت واحدہ کی جو بات کی ہے،اس سے کیامراد ہے؟

ہمارے ہاں عام طور پر بحث کی جاتی ہے کہ قرآن نے جس امت واحدہ کی بات کی ہے کیااس سے مراد صرف امت مسلمہ ہے یا نہیں بلکہ پوری بشریت جو کسی بھی آسمانی کتاب اور دین کی دعویدار ہے وہ مراد ہے لہٰذا ضرورت پیش آئی ہے کہ امت واحدۃ کے قرآنی مفہوم کو واضح کیا جائے دوسری وجہ خود عصر حاضر کے تقاضے ہیں کہ جب انسان ایک دوسرے کے اتنا قریب آ چکا ہے اور سوشل میڈیا نے یہ فاصلے سمیٹ دیے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے؟ دین کا کوئی ایسا ایک نظام نہیں ہے جو تمام مذاہب و ادیان کے پیروکاروں کے لئے قابل قبول ہو اور ہم انسانوں کو مذہب اور فرقے کی تقسیم سے باہر نکالے تاکہ تمام انسان مثبت سوچیں اور اس کے نتیجے میں انسانی معاشرے کو بہتر سے بہترین بنایا جاسکے اور پھر تیسری وجہ خود وحدت و یکجہتی کی اہمیت اور ضرورت ہے جو ہمیں مجبور کرتی ہے کہ اس بکھری ہوئی انسانی قوتوں کو یکجا کیا جائے اور آپس کی تقسیم اور فرقہ وارانہ سوچ اور روّیوں سے امت کو نجات دلا کر ایک امت بننے کی طرف قدم بڑھایا جائے یہ وہ بنیادی اسباب وجوہات تھیں جس کے تحت ہم نے اس موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ تو آیئے یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن نے جو امتِ واحدہ کا تصور دیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ اور مختلف مذاہب نے اس کی کیا تفسیر کی ہے؟

## امّت کا مفہوم

لغت میں امت کے کئی معانی ذکر کیے گئے ہیں: ا۔ درمیان ۲۔ لوگوں کی ایسی جماعت جن میں سے اکثر ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہوں اور ان میں خاندانی صفات جمع ہوں۔ ۳۔ قوم۔ ۴۔ تمام عمدہ خوبیوں کا جامع انسان جیسے قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے ارشاد ہوا: إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ كَانَ أُمَّةً یعنی: "ابراہیم ایک امّت تھے۔" ۵۔ روش اور طریقہ جیسے کہ ارشاد ہوا ہے: اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَاءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ ۷۔ مدّت؛ جیسا کہ ارشاد ہوا ہے: وَلَئِنْ أَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِلَىٰٓ أُمَّةٍ مَّعْدُودَةٍ ۸۔ قد و قامت۔ ۹۔ چہرے کے حسن کا ظہور۔ ۱۰۔ کنبہ اور فیملی۔ جبکہ مجلس الامۃ قومی اسمبلی کو کہا جاتا ہے۔[1]

راغب نے مفردات میں اس آیت میں امت سے مراد یہ لیا ہے کہ: "ہر اس گروہ اور جمعیت کے معنیٰ میں ہے کہ جس کی کوئی مشترک جہت اس کے افراد کو آپس میں جوڑے رکھے۔ ایک دین، ایک زمانہ یا ایک معین مکان کا اشتراک چاہے یہ وحدت اختیاری ہو یا غیر اختیاری۔ مجمع البیان میں علامہ طبرسی نے بھی کم و بیش یہی معنیٰ مراد لیا ہے۔ ایسی جماعت جس کا مقصد اور ہدف ایک ہو۔ قانون الٰہی اور شریعت کو ایک امت کہا گیا ہے کیونکہ اس میں پوری جماعت ایک مقصد پر اکٹھی ہوتی ہے اور ان کا ہدف ایک ہوتا ہے۔ پس امت سے مراد یا دین ہے: إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً یعنی تمہارا دین ایک ہے۔ یا جیسے مفردات راغب میں بتایا گیا ہے کہ ایسی جماعت جن کا ہدف و مقصد ایک ہو۔ بعض

لوگوں نے کہا ہے کہ امت سے مراد تمام زمانوں اور فرقوں کے تمام انسان ہیں یعنی اے تمام انسانو تم سب کے سب ایک ہی امت ہو تمہارا پروردگار بھی ایک ہے تمہارا ہدف بھی ایک ہے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں امت کی وحدت سے انسانیت کی وحدت مراد لی گئی ہے۔ لیکن یہ معنی اس آیت سے پہلے والی آیات سے مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ گذشتہ آیات میں حضرت مریمؑ اور دیگر چند انبیاء کا تذکرہ ہوا ہے۔

## قرآنی آیات میں امة واحدة کا استعمال

قرآن حکیم میں اگرچہ بہت ساری آیات میں امت واحدہ، یکجہتی، اتحاد و وحدت، انسان کی تکریم اور انتشار و اختلاف کے برے انجام اور نقصانات کے بارے گفتگو ہوئی ہے مگر پہلے ان آیات کا جائزہ لیتے ہیں جن میں امت واحدۃ کا کلمہ استعمال ہوا ہے۔ اس مختصر مقالے میں تمام آیات کا احاطہ مشکل ہے مگر چند آیات جو اس مطلب پر خصوصی طور پر ناظر ہیں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ إِنَّ هَـٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً [2]

صاحب تفسیر نمونہ نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا ہے: گزشتہ آیات میں خدا کے بعض پیغمبروں کے نام آئے ہیں اور اسی طرح حضرت مریمؑ جیسی مثالی خاتون کا نام آیا ہے۔ ان کے حالات زندگی بیان ہوئے ہیں۔

زیر بحث آیات میں مجموعی طور پر نتیجہ نکالتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ یہ عظیم پیغمبر کو جن کی طرف اشارہ ہوا ہے سب کے سب ایک ہی امت تھے۔ ان سب کا پروگرام ایک تھا ان کا ہدف و مقصد ایک تھا اگرچہ زمانہ اور ماحول کے اختلاف کے لحاظ سے مختلف خصوصیات اور ان کا انداز کار کچھ مختلف تھا۔ یعنی ان کی ٹیکنیک مختلف تھی۔ لیکن سب کے سب آخر الامر ایک ہی مسلک اور راہ پر گامزن تھے۔ وہ سب کے سب توحید کی راہ میں شرک کے خلاف جدوجہد کرتے تھے اور لوگوں کو یکجہتی، حق اور عدالت کی دعوت دیتے تھے۔ پروگراموں اور ہدف و مقصد کی وحدت و یگانگت اس بناء پر تھی کہ وہ سب کے سب ایک ہی مبداء سے فیض حاصل کرتے تھے کہ جو خدائے واحد و یکتا کا ارادہ تھا۔ لہٰذا ساتھ ہی فرمایا گیا ہے: وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ [3] یعنی: "اور میں تم سب کا پروردگار ہوں؛ پس تم صرف میری عبادت کرو۔"

صاحب تفسیر نمونہ کی اس وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ امت واحدہ سے مراد تمام انبیاء کے پیروکاروں کی امت ہے اور چونکہ تمام انبیاء کے پیغام کا سرچشمہ وحی الٰہی تھی لہٰذا ان کے پیغام میں کوئی اختلاف اور تضاد نہیں ہے اگر اختلاف نظر آتا ہے تو وہ فقط بشریت کے قوانین کا اختلاف ہے جس کی وجہ زمانے کے تقاضے اور شرائط ہیں چونکہ مختلف ادوار میں ہر زمانے کے اپنے تقاضے تھے لہٰذا ان تقاضوں اور شرائط کو مدّ نظر رکھتے ہوئے احکام بھی مختلف

ہیں ورنہ روح دین ایک ہے۔ دین میں وحدت ہے دین میں تعدّد نہیں ہے۔ شریعتیں مختلف رہی ہیں مگر دین جس میں خدائے واحد کی عبادت، شرک سے دوری اور عدل وانصاف کا قیام شامل ہے وہ ایک ہے۔

سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۹۳ بھی اسی نکتہ نظر کی تائید کرتی ہے کہ جس میں ارشاد ہوا: وَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ كُلٌّ إِلَيْنَا رَاجِعُونَ یعنی: "اور انہوں نے آپس میں تفرقہ ڈال دیا لیکن آخر کار سب کے سب ہماری طرف پلٹ کر آئیں گے۔"

اس آیت میں لوگوں کی اکثریت کے اس توحیدی بنیاد سے انحراف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے معاملے میں اختلاف کا شکار ہوگئے اور اختلاف اس حد تک پہنچ گیا کہ وہ ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑے ہوگئے اور ہر گروہ دوسرے گروہ کو لعن و نفرین کرنے لگا اور اس سے بیزار ہوگیا۔ انہوں نے اس پر قناعت نہ کی بلکہ ایک دوسرے کے مقابلے میں ہتھیار نکال لیے اور بہت زیادہ خونریزی کی اور یہ توحید اور دین واحد سے انحراف کا نتیجہ تھا۔

صاحب تفسیر نمونہ فرماتے ہیں: تقطعوا "قطع" کے مادہ سے ہے یعنی باہم ملی ہوئی چیز کو ٹکڑے کردینا۔ باب تفعیل سے آیا ہے جو قبول کرنے کے معنیٰ میں آتا ہے اس لحاظ سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ تفرقہ اور نفاق کے عوامل کے سامنے جھک گئے اور انہوں نے ایک دوسرے سے علیحدگی اور بیگانگی کو قبول کرکے اپنی فطری اور توحیدی وحدت کو ختم کردیا اور اس کے نتیجے میں ہر قسم کی شکست، ناکامی اور بدبختی میں گرفتار ہوگئے۔ [4]

علامہ سید علی نقوی تفسیر فصل الخطاب میں اسی آیت کے ذیل میں یوں گویا ہیں: امت سے مراد یہاں ملت ہے جبکہ بعض مفسرین نے امت کا معنیٰ دین کیا ہے اس طرح اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صحیح دین خلق خدا کا ایک ہے اور افتراق واختلاف بعد والوں کی ذہنی جدت طرازیوں سے پیدا ہوا ہے جنہیں قرآنی اصطلاح میں اھواء کہا جاتا ہے اور معیار حق نہیں ہو سکتے۔ (وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ) [5]

علامہ طبرسی نے قدیم مفسرین کے حوالہ سے اس کی تفسیریوں بیان کی ہے کہ ان هذه دينكم دين واحد عن ابن عباس والحسن والمجاهد واصل الامة الجماعة التى على مقصد واحد فجعلت الشريفه امة واحدة لاجتماعهم بها على مقصد واحد۔ صاحب مجمع البیان نے امت سے مراد دین لیا ہے یعنی تمہارا دین ایک ہے اور امت کا معنیٰ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ امت اس جماعت کو کہتے ہیں جس کا ہدف نگاہ ایک ہو پس قانون الٰہی کو ایک امت کہا گیا ہے کیونکہ اس میں پوری جماعت ایک مقصد پر اکٹھی ہوتی ہے اور سب کا ہدف ایک ہوتا ہے۔

علامہ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی اسی آیت کے ذیل میں امت سے مراد دین واحد لیا ہے اور اصل دین یہ تھا کہ صرف اللہ ہی انسان کا رب ہے اور اکیلے اللہ کی بندگی کی جانی چاہیئے۔

صاحب تفہیم القرآن نے اس مطلب کو یوں بیان کیا ہے (اس آیت میں تم کا خطاب تمام انسانوں کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے انسانو تم سب حقیقیت میں ایک ہی امت اور ایک ہی ملت تھے دنیا میں جتنے بھی نبی آئے وہ سب ایک ہی دین لے کر آئے تھے اور وہ اصل دین یہ تھا کہ صرف اللہ ہی انسان کا رب ہے اور اکیلے اللہ ہی کی پرستش وبندگی کی جانی چاہئے بعد میں جتنے مذاہب پیدا ہوئے وہ اسی دین کو بگاڑ کر بنا لئے گئے۔ اس کی کوئی چیز کسی نے لے لی اور کوئی دوسری چیز کسی اور نے اور پھر یہ ایک نے اس کا ایک ایک جز لے کر بہت ساری چیزیں اپنی طرف سے اس کے ساتھ ملالیں اس طرح یہ بے شمار ملتیں وجود میں آئیں۔ اب یہ خیال کرنا کہ فلاں بن فلاں مذہب کا بانی تھا اور فلان بن فلاں نے مذہب کی بنیاد ڈالی اور انسانیت میں پر ملتوں اور مذہبوں کا تفرقہ ابنیاء کا ڈالا ہوا ہے۔ محض ایک غلط خیال ہے۔ محض یہ کہ یہ ملت مختلف ملتیں اپنے آپ کو مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں کے انبیاء کی طرف منسوب کر رہی ہیں۔ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ملتوں اور مذہبوں کا یہ اختلاف انبیاء کا ڈالا ہوا ہے۔ خداکے بھیجے ہوئے انبیاء علیہم السلام مختلف مذہب نہیں بنا سکتے۔ اور نہ ایک خداکے سوا کسی اور کی بندگی سکھا سکتے تھے۔ [6]

صاحب تفسیر نور نے ان آیات سے یہ نکات اخذ کیے ہیں:

- تمام ادیان الٰہی کا ہدف اور مقصد ایک ہے۔ إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً
- توحید اور وحدت کلمہ تمام ادیان الٰہی کی بنیاد اور اساس ہے۔ أُمَّةً وَاحِدَةً
- ربوبیت کا لازمہ خدا کی بندگی ہے۔ وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ
- خداکے دین میں اختلاف کا سرچشمہ خود لوگ ہیں۔ وَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُم [7]

شیخ محسن قرائتی نے بھی امت واحدہ سے ہدف ومقصد میں ایک ہونا مراد لیا ہے یعنی تمام ادیان و تمام انبیاء کا ہدف ومقصد چونکہ ایک ہے اور وہ خدا کی وحدانیت وعبادت ہے لہٰذا تمام انسان ایک امت ہیں۔ عصر حاضر کے معتبر مفسر قرآن علامہ سید محمد حسین طباطبائی جن کی منفرد روش تفسیر یعنی قرآن کی قرآنی آیات سے تفسیر نے اس کتاب کو شہرہ آفاق بنا دیا ہے انہوں نے المیزان فی تفسیر القرآن میں اسی آیت کے ذیل میں یوں فرمایا ہے:

قوله تعالیٰ ان هذه امتكم امة واحدة وانا ربكم فاعبدون الامة جماعة يجمع علیٰ مقصد واحد والخطاب فی الآية علیٰ مايقهابه سياق الآايات خطاب عام يشمل جميع الافراد المكلفين من الانسان والمراد باالامة النوع الانسانی الذی هونوع واحد۔۔۔۔ [8]

علامہ طباطبائی نے بھی امت سے مراد ایسی جماعت لی ہے کہ جو ایک مقصد کے تحت جمع ہوں اور فرمایا کہ آیات میں خطاب (**امتکم**) عام ہے گذشتہ آیات کے سیاق کو دیکھتے ہوئے عام خطاب ہے جو انسان کے تمام مکلّف افراد کو شامل ہے اور امت سے مراد تمام نوع انسانی ہے جو کہ ایک نوع ہے۔

یعنی اے انسانو تمہاری یہ نوع انسانی ایک امت ہے اور میں چونکہ تمہارا مالک اور رب ہوں پس میری عبادت کرو۔ علامہ فرماتے ہیں کہ امت واحدہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ چونکہ تم امت واحدہ ہو لہٰذا اپنے رب کی عبادت کرو جب نوع انسانی ایک نوع ہے اور ایک مقصد کے تحت چلنے والی امت ہے اور وہ مقصد انسانی زندگی کی سعادت ہے تو پھر ان کا رب بھی ایک ہونا چاہئے کیونکہ ربوبیت اور الوھیت کوئی تشریعی منصب نہیں ہے کہ انسان اسے انتخاب کرنے میں اختیار رکھتا ہو بلکہ ربوبیت ایک تکوینی منصب ہے اور انسان کے امور کی تدبیر خدا کے ہاتھ میں ہے پس اسے عبادت بھی حقیقی رب کی کرنی چاہیئے نہ یہ کہ وہ اپنے لئے رب اختیار کرے اور ایک قوم اپنے لئے ایک معبود کو اختیار کرے دوسری قوم دوسرے معبود کو ایسا نہیں ہو سکتا چونکہ انسان ایک نوع ہے لہٰذا اس کا حقیقی اور تکوینی معبود بھی ایک ہے۔ صاحب المیزان فرماتے ہیں کہ یہاں امت سے مراد دین اسلام نہیں ہے۔ کیونکہ اگر امت کا استعمال دین کے معنی میں درست ہوتا کوئی قرینہ صارفہ ہوتا جو اس کو حقیقی معنیٰ سے انصراف دیتا۔ جبکہ سورہ یونس آیت 19 میں ارشاد ہوا ہے:

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّآ أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُواْ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ

ترجمہ: "ابتداء سارے انسان ایک ہی امت تھے بعد میں انہوں نے مختلف عقیدے اور مسلک بنا لیے اور اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ہی ایک بات طے نہ کر لی گئی ہوتی تو جس چیز میں وہ باہم اختلاف کر رہے ہیں اس کا فیصلہ کر دیا جاتا۔"

اس آیت میں واضح ہے کہ امت سے مراد تمام انسان اور نوع انسانی ہے۔

## امت مسلمہ یا امت واحدہ

قرآن حکیم نے جہاں بہت ساری آیات میں امت واحدہ کی بات کی ہے وہاں امت مسلمہ اور امت وسط کی بھی اصطلاح استعمال کی ہے۔ قرآن کا یہ خوبصورت اسلوب یقیناً کچھ نئے مطالب اور رموز کو واضح کرتا ہے: حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے جب خانہ کعبہ کو تعمیر کیا تو خدا سے کچھ دعائیں کی ہیں ان میں سے ایک دعا سورہ بقرہ آیت 128 میں بیان ہوئی:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ پروردگار ہمیں اپنے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا قرار دے اور ہماری اولاد میں سے ایسی امت بنا جو تیرے حضور سر تسلیم خم کرنے والی ہو[9] پس امت مسلمہ سے مراد مسلمان امت نہیں ہے جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کو کہا گیا کہ ابراہیمؑ مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلاَ نَصْرَانِيًّا وَلَكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا تو ابراہیمؑ کون سے مسلمان تھے اس وقت یہ اصطلاحی اسلام و مسلمان تو نہیں تھا قرآن کی اصطلاح میں مسلم فقط پیغمبر ﷺ کے پیروکاروں کے لئے خاص نہیں ہے بلکہ خدا کے سامنے تسلیم مطلق اور توحید کامل مرد ہے۔ یعنی کسی بھی مذہب اور دین کا پیروکار جو خدا کے قانون کے سامنے سر تسلیم خم کرے وہ مسلمان ہے۔

اسی طرح قرآن حکیم نے ایک اور مقام پر امت وسط کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے ارشاد ہوا:

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُواْ شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ[10]۔ ترجمہ: "اور اسی طرح (جیسے تمہارا قبلہ درمیانی ہے) ہم نے تمہیں ایک درمیانی امت بنایا ہے۔ (جو ہر لحاظ سے افراط و تفریط کے درمیان حد اعتدال ہے) تاکہ لوگوں کے لئے تم ایک نمونے کی امت بن سکو۔ یعنی امت مسلمہ ایک درمیانی امت ہے۔ لغت میں وسط کا معنٰی دو چیزوں کے درمیان حد وسط اور اس کا ایک اور معنٰی جاذب نظر اور خوبصورت بھی ہے ان دونوں معانی کی حقیقت ایک ہی ہے۔ کیونکہ خوبصورتی ہمیشہ اس چیز میں ہوتی ہے جو افراط و تفریط سے دور ہو اور مقام اعتدال پر ہو۔

امت وسط یعنی معتدل امت عقیدے کے لحاظ سے نہ غلو کو اپناتی ہے نہ تقصیر کو اور اسی طرح نہ جبر کو اپناتی ہے۔ نہ تفویض کو اور روحانیت کو بھول جائے اور نہ عالم عضویت میں ایسی ڈوبی ہوئی ہے کہ عیسائی راہبوں کی طرح بن جائے امت معتدل یعنی علم و دانش کے لحاظ سے بھی اعتدال ہو یعنی ایسا بھی نہ ہو کہ اپنی معلومات پر جمود کا شکار ہو جائے اور دوسرے کے علوم کی قدر دانی نہ کرے اور نہ احساس کمتری میں مبتلا ہو کر ہر آواز کے پیچھے لگ جائے۔

بعض روایات میں بھی اہل بیت علیہم السلام نے فرمایا: نحن الامة الوسطیٰ ونحن شهداء الله علیٰ خلقه وحجه علیٰ ارضه۔۔۔۔ ہم امت وسط ہیں ہم مخلوق پر شاہد ہیں اور زمین پر اس کی حجت ہیں ہم لوگوں پر گواہ غلو کرنے والوں کو ہماری طرف پلٹنا ہے اور تقصیر کرنے والوں کو چاہئے کہ یہ راہ چھوڑ کر ہم سے ملیں۔

قرآن نے ایک اور مقام پر امت واحدۃ کا ذکر یوں کیا ہے: كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ[11] (ابتداء) میں لوگوں کا ایک ہی گروہ تھا اور ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں تھا) رفتہ رفتہ گروہ اور طبقات پیدا ہوتے گئے) پھر خدا نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا تاکہ وہ لوگوں کو بشارت دیں اور ڈرائیں نیز ان پر آسمانی

کتاب بھی نازل کی۔ اس آیت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ امت واحدہ سے مراد پوری نوع انسان ہے نہ کوئی خاص مذہبی طبقہ۔

پس قرآنی اصطلاح میں امت مسلمہ۔ امت وسط اور امت واحدہ میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ ایک ہی حقیقت کی مختلف تفسیریں ہیں۔ اور سب قابل جمع ہیں۔

## مشترکات کی بنیاد پر وحدت

قرآن حکیم کسی ایک مسلک اور فرقے کی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ پوری انسانیت کاآئین اور منشور ہے نصاب کی کتاب ہے مگر کسی سکول وکالج کا نہیں بلکہ انسانیت کے نصاب کی کتاب ہے لہٰذا اسی تناظر میں قرآن کے جو مخاطین ہیں اس میں بھی وسعت اور عمومیت پائی جاتی ہے۔ اس آیت میں قرآن نے تمام اہل کتاب کو دعوت دی ہے۔ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْاْ إِلَى كَلَمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلاَّ نَعْبُدَ إِلاَّ اللّهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللّهِ فَإِن تَوَلَّوْاْ فَقُولُواْ اشْهَدُواْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ۔ ۔۔۔[12] ترجمہ: "کہیے اے اہل کتاب آؤ ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے کہ ہم سوائے خدا واحد کے کسی کی عبادت نہ کریں کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دیں۔ اور ہم میں سے بعض خدا کو چھوڑ کر بعض دوسروں کو خدا کے طور پر قبول نہ کریں۔ اس آیت میں قرآن حکیم نے اہل کتاب کو اسلام اور اہل کتاب کے مشترک نقاط کی طرف دعوت دی ہے۔ اور اس اسلوب دعوت میں بہت وسعت ہے۔ حقیقت میں اس طرز استدلال سے قرآن ہمیں سکھاتا ہے کہ اگر کچھ لوگ تمہارے تمام مقدس اہداف و مقاصد میں تمہارا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں تو پھر کوشش کرو کم از کم جس قدر تمہارے ساتھ چل سکتے ہیں مشترکات کی بنیاد پر ان کو ساتھ لے کر چلو۔ لہٰذا قرآن کا یہ انداز دعوت بھی امت واحدہ کی تشکیل کی طرف اشارہ ہے کہ اتحاد وحدت صرف مسلمانوں کے اندر ہی نہیں بلکہ اہل کتاب سے مشترکہ نکات کی بنیاد پر اتحاد ہونا چاہیئے اور اسی طرف شاید حضرت علی علیہ السلام نے اپنے اس خط میں جو مالک اشتر کو لکھا ہے اشارہ کیا ہے کہ اے مالک تیری رعیت میں دو قسم کے افراد ہیں یا تیرا دینی اور ایمانی بھائی یا تیرا انسانی بھائی ہے۔ پھر اس آیت میں غور و فکر کریں تو خدا نے خطاب میں یا اہل الکتب نہیں کہا بلکہ فرمایا یا اہل الکتاب اس میں ایک لطیف اشارہ ہے کہ آسمانی کتاب کوئی بھی ہو اس کا پیغام اس کی روح ایک ہے اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں کبھی تضاد نہیں ہے کسی نبی نے اپنے سے پہلے والے نبی کی نفی نہیں کی بلکہ ہمیشہ بعد والے نے قبل والے کی تائید اور تصدیق کی ہے۔

لہٰذا قرآن کا ایک اسلوب دعوت مشترکات کی بنیاد پر وحدت قائم کرنا ان مشترکات میں آسمانی کتابیں، انبیاء علیہم السلام کی بعثت خالق کی وحدت اور حقیقی معبود و رب کی وحدت اور قیامت کا تصور پھر اس کے ساتھ ساتھ تمام الٰہی ادیان نے انسانی اقدار (Human Values) کو زندہ کرنے کی بات کی ہے۔ اخلاقیات کی ترویج کی بات کی ہے یہ وہ مشترکہ نکات ہیں جن کی بنیاد پر آج بھی امت واحدہ تشکیل دی جاسکتی ہے اور انسانی معاشرے کو پر امن اور پیار و محبت کے رنگ سے خوبصورت بنایا جاسکتا ہے۔

## امت واحدہ کی تشکیل کے مراحل

جب یہ واضح ہوگیا کہ قرآن نے امت واحدہ کی تشکیل کو ضروری قرار دیا ہے تو پھر اگلے مرحلے میں اس بحث کو سمجھنا لازم ہے کہ امت واحدہ کی تشکیل کے کیا مراحل ہیں اور کہاں سے اس کا آغاز ہونا چاہئے۔ اتحاد و وحدت پر قرآن کی مختلف آیات میں بہت تاکید کی گئی ہے اور تفرقے اور اختلاف کے عواقب و نقصانات سے بھی قرآن نے خبردار کیا ہے۔ تفرقے سے بچنا کتنا ضروری ہے اس کا اندازہ حضرت ہارونؑ کے کردار سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تشریف لے گئے اور اپنی موحد قوم کو حضرت ہارونؑ کے سپرد کیا اور کہا کہ میرے آنے تک قوم کی حفاظت کرنا۔ مگر قوم سامری کے دھوکے میں آگئی اور بچھڑے کی پرستش شروع کردی تو حضرت ہارون پریشان ضرور ہوئے مگر قوم کو کچھ نہ کہا۔ اس ساری گمراہی و بدعملی کو برداشت کیا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے قوم کی حالت دیکھی تو ردّ عمل بڑا شدید تھا ہارونؑ کی داڑھی سے پکڑا اور کہا تم نے میری قوم کی حفاظت کیوں نہیں کی قرآن نے اس کی کو یوں بیان کیا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا[13] ترجمہ: "جب آپ نے ان کو گمراہی میں دیکھا تو ان کو منع کیوں نہیں کیا۔"

جواب میں حضرت ہارونؑ نے کہا قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذَٰلِكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي[14] مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ آپ یہ نہ کہیں کہ تم نے میرے اور میری قوم کے درمیان تفرقہ کیوں ڈالا یعنی حضرت ہارونؑ نے یہ ساری گمراہی اور انحراف کو برداشت کیا کس لئے تاکہ نبی اور اس کی بت پرست قوم کے درمیان تفرقہ پیدا نہ ہو۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تفرقہ سے بچنے کے لئے بت پرستی اور شرک جیسے برائی کے سامنے بھی خاموش ہونا پڑتا ہے۔

قرآن حکیم نے مختلف آیات میں مختلف انداز سے تفرقے کے نقصانات سے آگاہ بھی کیا ہے اور اس کے خطرناک نتائج کی نشاندہی بھی فرمائی ہے۔ سورہ آل عمران 105 میں ارشاد ہوا: وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن

بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَـٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ترجمہ: "تم ان کی طرح نہ بنو جنھوں نے تفرقہ کیا ہے اور روشن دلیلیں آنے کے بعد بھی بٹ گئے ہیں اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔"

اس آیت میں تفرقہ بازی سے اجتناب کرنے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے یہ آیت مسلمانوں کو گذشتہ اقوام یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح تفرقہ او راختلاف کی راہ اختیار کرنے اور اپنے لئے عظیم عذاب مول لینے سے ڈراتی ہے اس آیت میں تفرقہ اور اختلاف سے اجتناب کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہارے معاشرے میں بھی ایسا ہونے والا ہے کیونکہ جہاں کہیں کس چیز سے ڈرانے میں اصرار کیا جاتا ہے وہ اس کے وقوع کی طرف اشارہ ہے پیغمبر اسلام ﷺ نے پشین گوئی کی تھی اور صداقت سے مسلمانوں کو خبر دی تھی کہ یہودی قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسائی قوم 71 اور 72 فرقوں میں بٹ گئی تھی اور میری امت میرے بعد 73 فرقوں میں بٹ جانے گی۔

پس ایک چیز واضح ہے کہ اختلاف وانتشار سے کسی بھی قوم کا وقار اور طاقت کھو جاتی ہے اور دوسرے اس کو اپنا غلام بنا لیتے ہیں وہ سوسائٹی بے برکت بن جاتی ہے جس میں اختلاف پیدا ہو جائے لہٰذا امت واحدہ بنانے کا پہلا عمل لوگوں میں یہ آگاہی (Awareness) پیدا کرنا ہے کہ اختلاف وانتشار کے کتنے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں اور گذشتہ اقوام جن میں تفرقہ پیدا ہوا انہوں نے ذلت ورسوائی کا سامنا کیا۔ اتحاد کی برکات اور انتشار کے مضر نقصانات کے حوالے بھرپور آگاہی مہم چلانے کی ضرورت ہے لوگوں کو تنگ نظری، منفی رویوں اور شدّت پسندی سے نکالنا ہوگا اور مثبت سوچ، رواداری اور تحمل وبرداشت کا جذبہ پیدا کرنا ہوگا۔ اسلام تو غیر مسلموں کے عبادت خانوں کو محترم جانتا ہے اور ان کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے اسلام تو امن وسلامتی کے ساتھ رہنے والا غیر مسلمانوں کو ذمی کہتا ہے یعنی ان کی جان مال آبرو کی حفاظت ہمارے ذمے آجاتی ہے۔

## اتحاد وحدت کے عملی راستے اور امکانات

اگرچہ امت واحدہ کا موضوع اور اتحاد ووحدت کے حوالے سے قرآن کی متعدد آیات نے ہماری راہنمائی کی ہے مگر اختصار کے پیش نظر ان تمام آیات کا احاطہ ناممکن ہے لہٰذا موضوع کو سمیٹتے ہوئے عملی تجاویز اور ممکنہ عملی راستے بیان کرتے ہیں کہ اس مقدس ہدف کا حصول کیسے ممکن ہے اور اس کے عملی راستے کون سے ہیں؟ ظاہر ہے ہمارے پیش نظر وطن عزیز پاکستان میں بسنے والے تمام ادیان مذاہب کے پیروکاروں کی وحدت و ہم آہنگی اور بالخصوص امتِ مسلمہ کی ہم آہنگی ہے۔ میرے خیال میں ہمیں اتحاد وحدت کی اہمت، ضرورت والی مباحث سے آگے بڑھنا ہوگا اور معمول کے سمینارز کانفرنسز بہت ہو چکی ہیں ان سے نکل کر زمینی حقائق کیا ہیں اور عملی وحدت کیسے ممکن ہے اس پر گفتگو کی ضرورت ہے۔ امت واحدہ کی تشکیل میں مختلف طبقات کی ذمہ داری ہے اور اس کے کئی ستون

ہیں ان میں سے اہم ستون خود ریاست ہے دوسرے درجے میں مذہبی قیادت ہے جنہوں نے قوموں کی رہنمائی کرنی ہے تیسرے مقام پر سول سوسائٹی اور پھر چوتھے مرحلے میں میڈیا ہے میڈیا سے ہماری مراد پرنٹ الیکٹرانک اور سوشل میڈیا ہے۔ اگر یہ تمام طبقات اپنی اپنی ذمہ داری کو ادا کریں تو میرے خیال میں پاکستان میں بسنے والے تمام پاکستانیوں کو پیار، محبت وامن واخوت کے رشتے میں جوڑا جاسکتا ہے اور ایک پر امن معاشرے کی تشکیل کا خواب عملی کیا جاسکتا ہے۔

1) تمام مذاہب کے جیدّ علماء کرام اور مفتیان عظام پر مشتمل ایک کمیشن بنایا جائے جو فتویٰ دینے کا مجاز ہو انفرادی طور پر فتاویٰ پر پابندی لگائی جائے۔
2) ایک ایسے تعلیمی ادارے یونیورسٹی یا مدرسہ کے قیام کی ضرورت ہے جہاں تمام مسالک کے طلبہ بلاخوف و خطر مکالمہ کرسکیں اور جہاں تمام مسالک کی تعبیر و تفسیرات بڑھائی جائیں۔
3) آئمہ جمعہ کو پابند کیا جائے کہ وہ مذہبی منافرت والی گفتگو سے پرہیز کریں۔
4) فرقہ وارت اور شدت پسندی کو ریاستی سطح پر سختی سے روکا جائے اور حوصلہ شکنی کی جائے۔
5) بین المسالک و بین المذاہب ہم آہنگی کو سکولوں، کالجز اور یونیورسٹیز کے نصاب میں شامل کیا جائے اور جمعہ کے خطبات میں اس کو فروغ دیا جائے۔
6) کسی بھی مسلک یا مذہب کے عقیدے یا رائے کو اس مذہب کے معتبر علماء اور معتبر کتابوں سے معلوم کیا جائے۔ کسی ایک فرد کی رائے کو عملاً کسی فرقے یا مسلک کی رائے نہ سمجھا جائے۔
7) منبر و محراب سے رواداری انسانیت کی تکریم، قانون کا احترام انسانی و شہری حقوق اور عمومی اخلاقیات کو لازمی بیان کیا جائے۔
8) بین المدارس نعت خوانی قرائت، تقریری مقابلے اور کھیلوں کے مقابلے کرائے جائیں۔
9) مختلف مذاہب کے علماء دوسرے مذہب کے تعلیمی اداروں مدارس، مساجد اور ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے کے مواقع پیدا کریں۔
10) حکومتی سطح پر کچھ ماہانہ جرائد ورسائل شائع کئے جائیں جن میں ہم آہنگی اور امن کے موضوعات شامل ہوں۔
11) الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر منافرت پر مبنی خطابات اور شدت پسندی کے حامل افراد کو نمائندگی دینے کی بجائے تمام مسالک کے ایسے علماء ومفتیان کو لایا جائے جو ہم آہنگی بین المذاہب کا جذبہ رکھتے ہوں اور اس فکر و سوچ کا پرچار کریں۔

*****

## حوالہ جات

1۔المعجم الوسیط، تحت لفظ "امت"

2۔انبیاء،92:21

3۔ایضاً

4۔مکارم شیرازی،560:7

5۔مومنون،23: 71

6۔مودودی، 185:3

7۔قرائتی،494:7

8۔الطباطبائی،322:14

9۔الحویزی،134:1

10۔بقرہ،143:2

11۔ایضاً2: 213

12۔آل عمران،64:3

13۔طٰہ،92:20

14۔ایضاً

## کتابیات


1. قرآن مجید
2. الحویزی، علی بن جمعۃ، نورالثقلین، مطبعۃالحکم، قم، ایران
3. الطباطبائی، السید محمد حسین، تفسیر المیزان، منشورات جماعۃالمدرسین فی الحوزۃالعلمیّۃ، قم
4. الطبرسی، فضل بن حسن، شیخ، مجمع البیان، دارالکتب العلمیہ، بیروت

5. قرائتی، محسن، تفسیر نور، مرکز فرہنگی درس ھای قرآن، تہران
6. المعجم الوسیط، عربی اردو، مکتبہ رحمانیہ، لاہور
7. مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، مترجم (سید صفدر حسین نجفی) مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور، 1417ھ
8. مودودی، ابوالاعلی، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور

# اسلامی ثقافت کا قدیم شہر ''منصورہ'' (تاریخی و سیاسی جغرافیا)

# *MANSORA AN ANCIENT CITY OF ISLAMIC CIVILIZATION: HISTORICAL AND POLITICAL GEOGRAPHY*

Faizan Jafar Ali


## *Abstract:*

*Like geographers, historians have also dealt in their books with the conditions of the earth, its longitudinal and altitudinal dimensions, boundaries etc that have been connected directly with human life. Furthermore, historians have discussed sociopolitical and religious conditions of a territory with respect to its significance. The Muslim historians and geographers of the first Islamic century have gathered information regarding the newly-established Muslim cities of the aforementioned century; Mansora is among those cities which was built after the Islamic conquest of Sindh. It is considered first city of Islamic civilization in Sindh. This article discusses the following questions in the light of the available historical and geographical information and documents. This article shows that in which part of the Sindh Mansora was situated? When it was built? Where it is located in present day Pakistan? What is its historical and geographical significance?*


***Key words:*** *Geography,* Mansora, *Sindh, Early Islam, Islamic Culture.*

**کلیدی کلمات:** جغرافیا، منصورہ، سندھ، صدر اسلام، اسلامی ثقافت۔

## تمہید

جغرافیا ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعہ ہم زمان و مکان کے رابطے اور انسانی زندگی کے مختلف گوشوں کو تاریخ کے ترازو پر پرکھتے ہیں۔ جغرافیا دانوں کی طرح مورخین نے بھی زمین کی تمام ترکیفیت، طول و عرض حدود، راستوں وغیرہ سے متعلق ان گوشوں کو اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے جن کا رابطہ باقاعدہ طور پر انسانی زندگی سے رہا ہے۔ اسی طرح مورخین کا دوسرا کام یہ بھی رہا ہے کہ کسی علاقہ یا سرزمین کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے، اس کے تمام تر کوائف یعنی اقتصادی سماجی و مذہبی حالات سے آگاہی کرائی ہے۔ اسلام کی ابتدائی صدی ہجری کے بہت سے ایسے مورخوں اور

جغرافیادانوں نے ابتدائی صدی ہجری کے نئے بسنے والے اسلامی شہروں کے بارے میں بے شمار بکھری ہوئی اطلاعات فراہم کی ہیں۔ انہیں اسلامی شہروں میں، منصورہ ”Mansora“ شہر کا بھی شمار ہوتا ہے جسے مسلمانوں کے ہاتھوں سندھ کے فتح ہونے کے بعد بسایا گیا اور سندھ میں یہ اسلامی ثقافت و تمدن کا پہلا شہر قرار پایا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ شہر سندھ کے کس سمت میں واقع تھا اور کب تاسیس ہوا اور موجودہ پاکستان میں اس جگہ کہاں ہے؟ اور تاریخی و جغرافیائی نکتہ نظر سے اس شہر کی کیا اہمیت ہے؟ یہ وہ تمام سوالات ہیں جن کے جوابات کو تاریخی اور جغرافیائی اطلاعات اور دستاویزوں کی بنیاد پر ایک منظّم صورت اس مقالہ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

## شہر منصورہ کا قیام

منصورہ، سندھ کی سرزمین پر واقع ایک ایسا شہر تھا جو دوسری صدی ہجری کے اوائل میں مسلمانوں کے ذریعے وجود میں آیا اور بہت جلد سندھ کا مرکز قرار پا گیا۔ یہ شہر ایسی جگہ پر واقع تھا جہاں سے چاروں سمت میں دریائی اور زمینی راستے بھی موجود تھے جن میں ایک راستہ ملتان اور کشمیر کو جاتا تھا، دوسرا اسندان و صیمور، تیسرا طوران اور غزنین اور چوتھا دیبل اور تیز کو جاتا تھا۔ چونکہ یہ شہر سندھ کا محور و مرکز تھا اس وجہ سے اقتصادی اور اجتماعی لحاظ سے بھی ایک خاص اہمیت کا حامل رہا ہے کہ جس میں اسلامی تہذیب و تمدن کو وسعت دینا اس کا ایک کارنامہ ہے۔ اسی لئے تاریخ اسلام کی قدیم کتابوں اس شہر سے مربوط پائے جانے والے اسلامی اور تاریخی مواد کی بنیاد پر ہم نے اپنے اس مقالہ میں شہر منصورہ کا تاریخی و سیاسی پس منظر بیان کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس شہر کی اصلی جگہ کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ اس وقت کی سماجی و سیاسی حالات پر بھی روشنی ڈالیں جس سے ہم اس کے قیام اور زوال کے اسباب کا بھی اندازہ لگا سکیں۔ مورخین اور جغرافیادانوں کا خیال ہے کہ منصورہ شہر کے قیام سے قبل وہاں کی سرزمین جنگل تھی جو ”برہمن آباد“ سے دو فرسنگ دوری پر واقع تھا۔[1]۔ البتہ بعض تاریخی روایت کے مطابق شہر ”منصورہ“ اسی ”برہمن آباد“ ہی کی سرزمین پر بنایا گیا تھا۔[2] بیرونی نے بھی منصورہ کی قدیم جگہ کو وہیں پر قرار دیا ہے۔[3] شہر منصورہ کی تاسیس سے متعلق یعقوبی (متوفی ۲۸۴ھ)، بلاذری (متوفی ۲۷۹ھ) اور ابن اثیر نے روایت کی ہے کہ جب حکم ابن عوانہ کلبی (۱۱۰۔۱۲۶ھ) کو سندھ کا والی بنا کر بھیجا گیا تو اس نے مسلمانوں کی سکونت کے لئے ایک شہر بسایا جس کا نام محفوظہ رکھا۔[4] حکم ابن عوانہ کلبی نے وہاں سکونت اختیار کی اور عمرو ابن محمد ابن قاسم بھی اس کے ساتھ تھا لہٰذا حکم بن عوانہ نے بہت سے اہم کام اس کے سپرد کرتے ہوئے اس کو کسی جنگی محاذ پر بھیجا۔ جب وہ جنگ میں فتح حاصل کرکے واپس آیا تو اسے دستور دیا کہ سندھ میں ایک نیا شہر بنائے جو اسلامی تہذیب و ثقافت کا نمونہ قرار پائے لہٰذا عمرو ابن محمد ابن قاسم نے نہر کے کنارے ایک شہر کی تعمیر کرائی

جس کا نام ''منصورہ'' رکھا۔[5] سندھ میں یہ وہ پہلا شہر تھا جسے شہری اصول کے مطابق تعمیر کیا گیا تھا۔[6] یہی شہر آگے چل کر اسلامی حکومت کے والیوں کی سکونت گاقرار پایا۔[7] اس شہر کے سترہ سال بعد شہر بغداد کو بھی منصورہ کے شہری اصول کے مطابق تعمیر کیا گیا تھا[8] اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شہر منصورہ کس اہمیت کا حامل رہا ہوگا کہ بغداد جیسے قدیم اسلامی شہر کو بنانے کے لئے سندھ میں واقع منصورہ کو نمونہ قرار دیا گیا۔

## اسلامی جغرافیا کی قدیمی کتابوں میں منصورہ اور اس کے ماتحت علاقوں کا ذکر

اصطخری (متوفی حدود ۳۴۰ھ) اور ابن حوقل (متوفی حدود ۳۶۶ھ) کا بیان ہے کہ ''منصورہ'' کا طول و عرض ایک میل پر مشتمل تھا جس کو مہران نہر نے اپنے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔[9] اس کے ماتحت مشہور علاقوں کے نام دیبل[10]، زندریج، کدارمایل، تنبلی، نیرون، قالری، انرّی، بلرّی، مسواہی، بہرج، بانیہ، منجابری، سوسان، رور (روڑ) سوبارہ، کنبانہ، صیمور وغیرہ تحریر کئے گئے ہیں۔[11] ان مشہور علاقوں کے علاوہ تین ہزار دیہات ایسے تھے جو اسی شہر منصورہ کے ماتحت قرار پاتے تھے۔[12] ملتان کے نزدیک ایک علاقہ تھا جس کا نام رور (روڑ) تھا اور وہ مہران ندی کے کنارے پر واقع تھا یہی علاقہ منصورہ کی سرحد قرار پاتا تھا۔[13] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری صدی ہجری میں سندھ میں دو بڑے اور مرکزی شہر تھے جن میں ایک ملتان اور دوسرا منصورہ تھا۔ ہم نے ذیل میں شہر منصورہ کے ماتحت اور اس کے اطراف میں واقع علاقوں اور دیہاتوں کے نام کا ایک خاکہ بنایا ہے اور یہ خاکہ اسلامی جغرافیا کی قدیم کتابوں میں پائی جانے والی اطلاعات کو مد نظر رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے جو کہ مندرجہ ذیل ہے۔

| ابن حوقل کی کتاب صورۃ الارض کے قلمی نسخہ صفحہ 179 سے ماخوذ | اصطخری کی کتاب مسالک الممالک کے قلمی نسخہ صفحہ 102-105 سے ماخوذ | مقدسی کی کتاب احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم کی جلد 2، صفحہ 702-703 سے ماخوذ |
|---|---|---|
| قسدار | دیبل | دیبل |
| دیبل[14] | نیرون | زندریج |
| نیرون[15] | قالری | کدارمایل |
| قالری | انری | تنبلی |
| انری | بلرّی | نیرون |

| | | |
|---|---|---|
| بلرّی | مسواہی | قالری |
| مسواہی | بہرج | انری |
| فہرج[16] | بانیہ | بلرّی |
| بانیہ | منجابری | مسواہی |
| منجابری | سدوسان | بہرج |
| سدوستان | رور | بانیہ |
| رور | قامہل | منجابری |
| جندور | کنبایہ | سدوسان |
| قامہل | سوبارہ | رور |
| کنبایہ | سندان[17] | قامہل |
| سوبارہ | صیمور | کیناص |
| سندان | | سوبذرہ |
| صیمور[18] | | سندان، صیمور |

مذکورہ بالا خاکے کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ موجودہ پاکستان کے کس علاقہ میں شہر منصورہ کو بنایا اور بسایا گیا تھا البتہ آج کی بعض اطلاعات کے مطابق یہ کہا جاتا ہے کہ منصورہ کا بکھرا ہوا کھنڈر حیدرآباد شہر کے مشرقی شمال سے ۷۱ میل کے فاصلہ پر موجود ہے[19] جو چار میل پر مشتمل شہدادپور (Shahdadpur) علاقہ کے نزدیک واقع ہے۔[20] عزیز اللہ عطاردی[21] کے بقول منصورہ، ''پیر جھندی والا'' علاقہ کے نزدیک واقع ہے جو حیدرآباد سے ساٹھ میل فاصلہ پر واقع ہے۔[22]

## مورخین کی نظر میں منصورہ شہر کی ثقافت

منصورہ سندھ کا وہ پہلا اسلامی شہر تھا جو چوتھی صدی ہجری کے آخر تک اسلامی گورنروں کا مسکن قرار پایا تھا اس لئے ہجرت کرنے والے افراد یا تاجر افراد جو مختلف جگہوں سے اس سرزمین پر قدم رکھتے تھے وہ ''منصورہ'' ہی میں سکونت اختیار کرتے تھے۔ ابتدائی صدی ہجری کے مورخوں نے منصورہ کی تہذیب و ثقافت کے بارے میں بہت سی

اطلاعات فراہم کی ہیں اور لکھا ہے کہ سندھ کی سرزمین پر منصورہ بہت بڑا اور بابرکت اسلامی شہر تھا[23] جہاں کی ہوا ملایم تھی اور سردیاں معتدل، بارش بہت ہوتی تھی اور گرمی بہت سخت پڑتی تھی اور وہاں مچھر بہت پائے جاتے تھے۔[24] یہ شہر، دمشق اور نیشاپور کی طرح سندھ کے مرکز میں واقع تھا، وہاں کے مکانات مٹی اور لکڑی کے ہوتے تھے۔[25] اس شہر کے چار دروازے تھے ایک دروازہ ندی کی طرف تھا، دوسرا دروازہ توران کی طرف، تیسرا دروازہ سندان کی طرف اور چوتھا دروازہ ملتان کی طرف کھلتا تھا اور اس شہر کے چاروں طرف نہر تھی۔[26] اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے چاروں سمت راستے موجود تھے شمال کی جانب ملتان اور کشمیر، جنوب میں دیبل اور مشرق میں سندان جو راستہ ہندوستان کو جاتا تھا اور مغرب میں طوران کا راستہ تھا یہ تمام راستے منصورہ سے جا کر ملتے تھے اور منصورہ ایک جزیزہ نما شہر تھا جس کے دریائی راستے میں مختلف جگہوں کو جا کر ملتے تھے۔

یہاں گنا کثرت سے پایا جاتا تھا اور ایک ایسا پھل بھی موجود تھا جسے وہاں کے لوگ بہلویہ[27] کہتے تھے جو بہت ہی ترش ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ آم بھی پایا جاتا تھا جو بہت ہی سستا ہوتا تھا۔ وہاں دو طرح کے پیسے رائج تھے ایک کو قاہریات[28] کہتے تھے اور دوسرے کو طاطری[29] کہتے تھے لیکن معلاملات میں دینار کو فوقیت حاصل تھی۔[30] منصورہ میں بہت سی مفید دوائیں، کنباتی جوتے، ہاتھی کے دانت وغیرے کے علاوہ بہت سی دیگر اشیاء پائی جاتی تھیں جسے مختلف جگہوں پر بھیجا جاتا تھا۔[31]

یہاں کے لوگ بلند قامت[32] اور شایستہ، باہوش، چالاک و مہربان اور بلغمی مزاج کے مالک ہوتے تھے۔ اسلام یہاں پر بہت پھولا پھلا اور بہت سے دانشور اور تاجروں نے جنم لیا۔ وہاں کے لوگوں کا رسم و رواج اور عادت عراقیوں سے کچھ ملتا جلتا تھا البتہ وہاں بد اخلاق کافروں کا وجود بھی زیادہ نظر آتا تھا[33] جبکہ یاقوت حموی، اصطخری اور ابن حوقل کے مطابق منصورہ میں رہنے والے تمام لوگ مسلمان تھے۔[34] منصورہ اور ملتان کے لوگ عربی اور سندھی زبان میں بات کرتے تھے۔[35] منصورہ کے لوگوں کا لباس عراقیوں کے لباس سے ملتا جلتا تھا۔[36] وہاں کے اکثر لوگ ابو حنیفہ کے پیروکار تھے۔[37] ایسا لگتا ہے کہ منصورہ کے قیام کے وقت وہاں مسلمان اکثریت میں تھے لیکن مرور ایام کے ساتھ ساتھ وہاں کچھ دوسری قومیں بھی سکونت اختیار کرلی جیساکہ مقدسی نے لکھا ہے کہ وہاں کے کافر بہت بد اخلاق ہیں[38] اور مسعودی کے بقول وہاں پر مید[39] نامی ایک قوم پائی جاتی ہے جو بہت ہی جنگجو ہوتے ہیں اور یہ لوگ سندھ کے سرحد کی نگہبانی کرتے ہیں۔[40]

## منصورہ کا زمینی (برّی) اور دریائی (بحری) راستہ

اس عنوان کے ذیل میں ہم اسلامی جغرافیا کی کتابوں کی اطلاعات کو مد نظر رکھتے ہوئے منصورہ کے زمینی اور دریائی راستوں کو نقشہ کے ساتھ بیان کریں گے اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کو بھی بیان کرنے کی کوشش کریں گے کہ کس زمانے میں ان راستوں میں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔

ا۔ زمینی یا برّی راستہ

### الف: منصورہ سے مختلف جگہوں کا راستہ

منصورہ سے مختلف جگہ جانے کی جو مسافت تھی اس کے بارے میں جغرافیا دانوں نے لکھا ہے کہ منصورہ سے دیبل کا فاصلہ چھ مرحلوں کا تھا[41] اور وہاں سے ملتان کا فاصلہ بارہ مرحلہ اور طوران پندرہ مرحلہ [42] اور بڑھہ سرحد کے آغاز تک پانچ مرحلہ [43] اور تیز تک پندرہ مرحلہ کا فاصلہ تھا۔[44] اسی طرح منصورہ سے قامل آٹھ مرحلہ، پھر کنبایہ تک چار مرحلہ، پھر وہاں سے سوبارہ تک جانے کے لئے ایک فرسنگ دریا کا راستہ قرار پاتا تھا۔[45] اسی طرح منصورہ سے قزدار تک ۸۰ فرسنگ اور پھر وہاں سے کنابان تک بھی ۸۰ فرسنگ اور پھر سیوہ اور شہر ولاشتان تک بھی ۸۰ فرسنگ اور ساغن تک جانے کے لئے ۶۰ فرسنگ اور پھر وہاں سے غزنین ایک مرحلہ پر واقع تھا۔[46]

### ب: مختلف جگہوں سے منصورہ تک پہنچنے کے راستے

ہر وہ راستہ جو مختلف جگہوں سے منصورہ کو جاتا تھا اور اس کی کتنی مسافت ہوتی تھی اس کو ہم نے مورخین اور جغرافیا دانوں کی اطلاعات کے مطابق بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ کشمیر اور منصورہ کا جو خشکی راستہ تھا وہ ۷۰ دن کا ہوتا تھا لیکن مہران ندی کا سہارا لیتے ہوئے اگر کوئی جاتا تھا تو وہ راستہ چالیس دن میں طے کرلیتا تھا۔[47] قندابیل سے منصورہ آٹھ مرحلہ بتایا گیا ہے) [48] لیکن ملتان سے منصورہ تک کی مسافت کے بارے میں جغرافیا دانوں اور مورخین کے درمیان اختلاف نظر آتا ہے۔ مسعوی نے لکھا ہے کہ سندھی اعتبار سے ملتان سے منصورہ ۷۵ فرسخ کی مسافت تھی اور ہر فرسخ آٹھ میل کے برابر ہوتا تھا۔[49] مقدسی کے بقول اگر کوئی دیہات، دیہات ہوتے ہوئے ملتان سے منصورہ جائے تو چالیس فرسنگ کی مسافت ہے۔[50] پھر اس نے اس کی توضیحات یوں بیان کی ہیں کہ ملتان سے بسمدہ دو مرحلہ، پھر وہاں سے رور (روڑ) تین مرحلہ، پھر انڑّی چار مرحلہ، پھر قالرّی دو مرحلہ پھر وہاں سے منصورہ ایک مرحلہ کی مسافت ہے۔[51] مکران سے منصورہ کی مسافت ۳۵۸ فرسنگ تحریر کی گئی ہے۔[52] لیکن ابن خرداذبہ نے لکھا ہے کہ ۳۵۳ فرسخ کا فاصلہ تھا اور یہ راستہ جاٹوں کی سرزمین سے ہوتا ہوا منصورہ تک پہنچتا تھا۔[53] ہم نے یہاں پر

وہ نقشہ پیش کیا ہے جو ابن حوقل اور اصطخری نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے تاکہ منصورہ کے اطراف میں واقع تمام علاقے اچھی طرح روشن ہو جائیں۔

ترسیم بر اساس اطلاعات ابن حوقل، کتاب عرب و هند تالیف سلیمان ندوی، سال ۱۳۳۲ هش

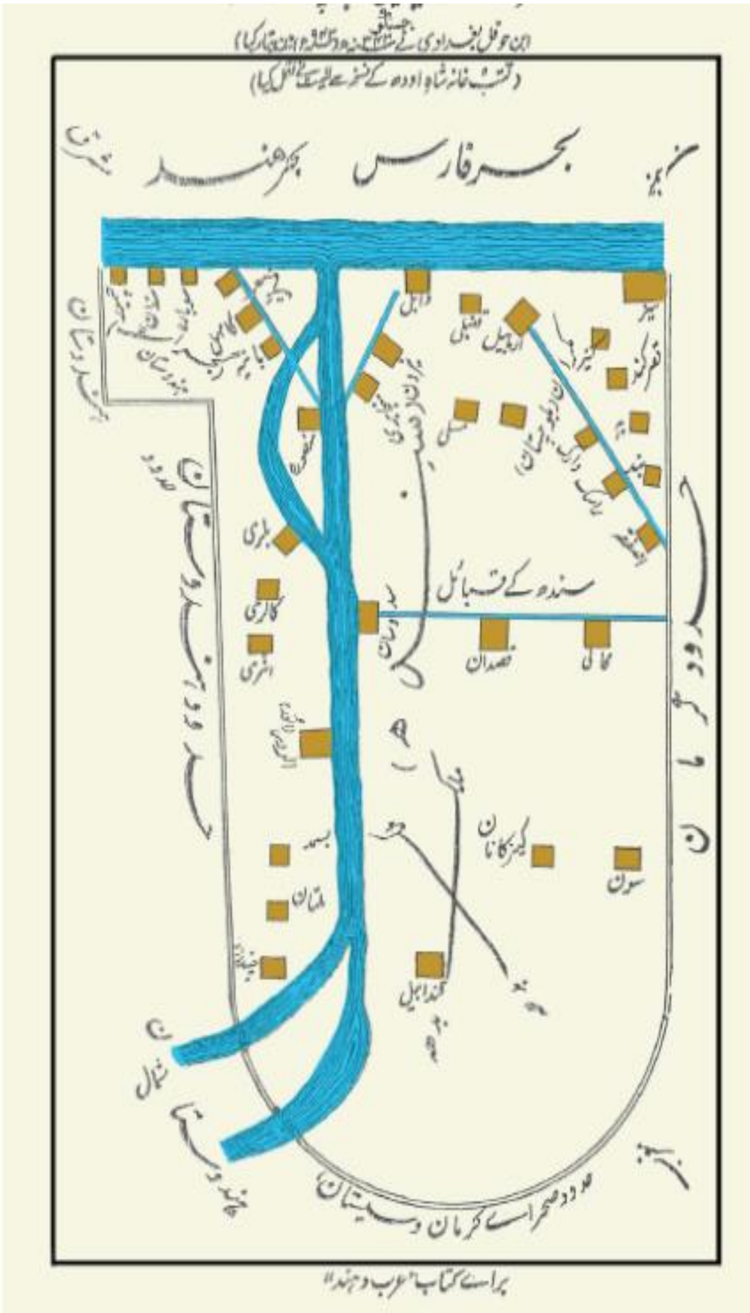

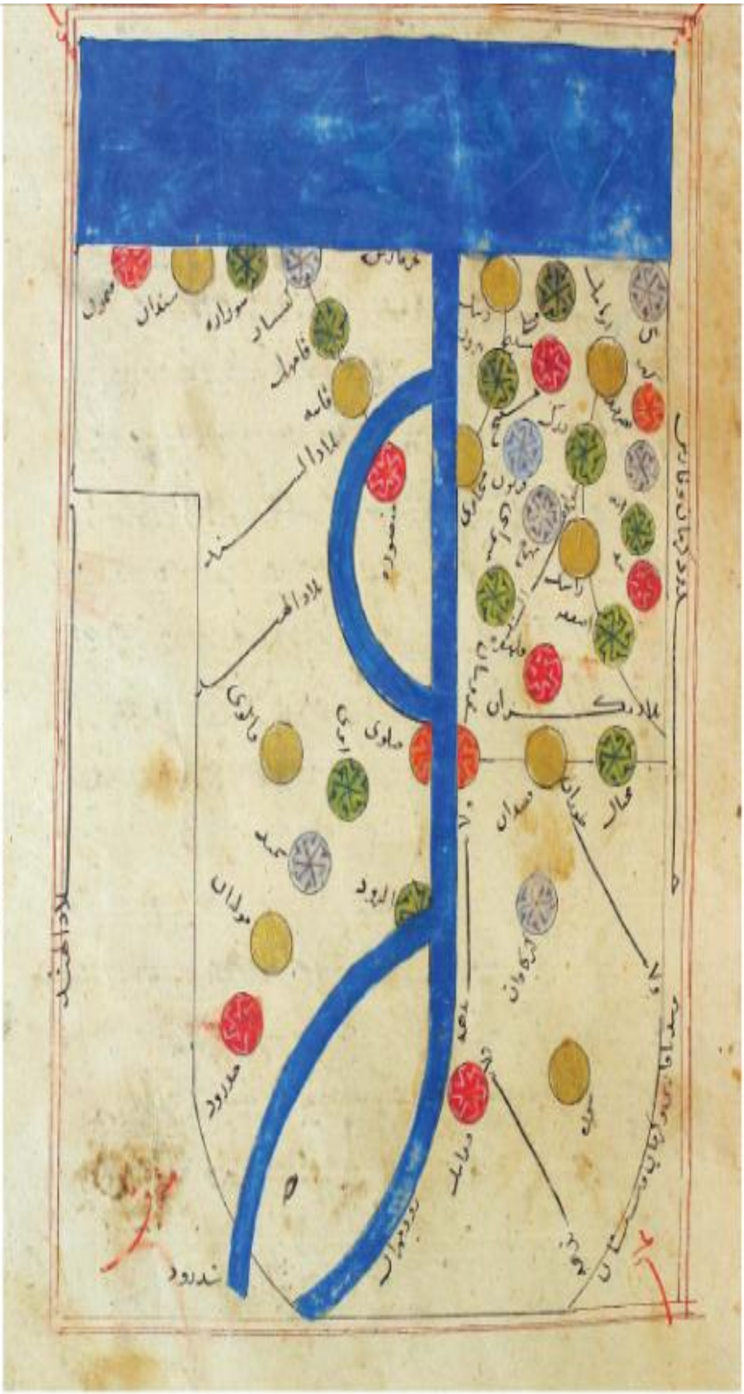
منصوره
سندان
بلاد السند

جیسا کہ مقدسی نے لکھا ہے کہ منصورہ کے چار دروازے تھے ایک ملتان کی طرف دوسرا سندان، تیسرا توران اور چوتھا بحر ہند کی طرف کھلتا تھا۔ اسی بنیاد پر ہم نے ان تمام دروازوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک نقشہ کھینچا ہے تاکہ بہتر طریقے سے منصورہ شہر کا احاطہ کر سکیں۔

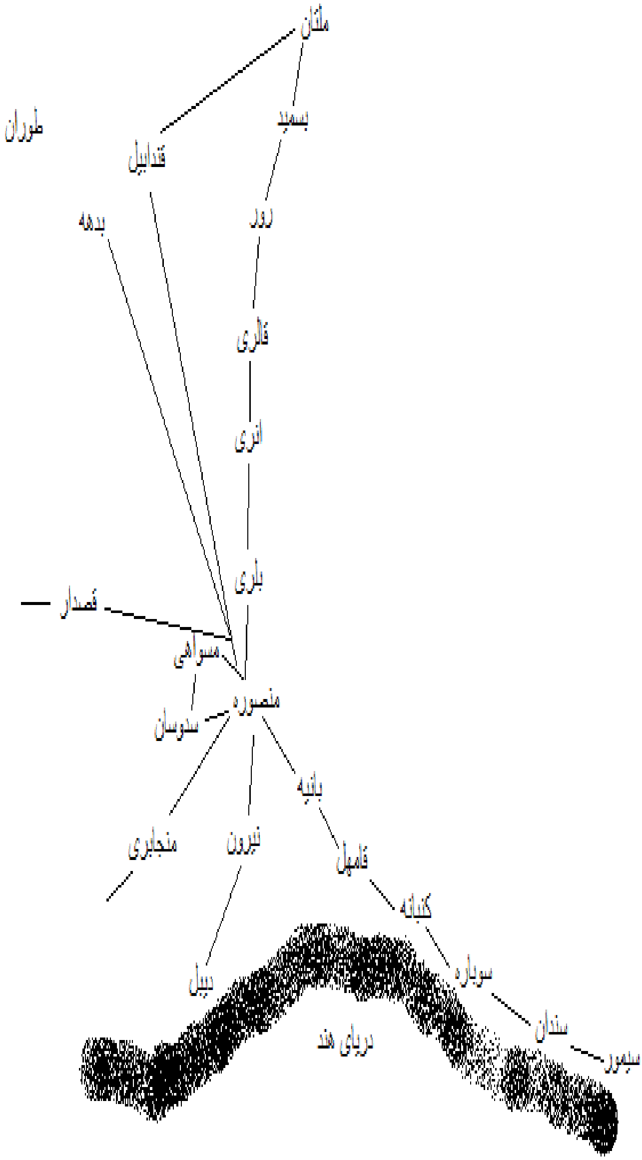

## ۲۔ دریائی یا بحری راستہ

سندھ میں موجود سب سے بڑی ندی یا نہر جسے قدیمی کتابوں میں مہران نہر یا ندی کے نام سے یاد کیا گیا ہے جغرافیادانوں اور مورخین کی نظر میں اس ندی کی بہت اہمیت رہی ہے اور انہوں نے اپنی اپنی کتابوں میں اس ندی اور اس کے اطراف بسنے والے شہروں اور دیہاتوں کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ یہ ندی شمالی جانب سے بحر ہند میں جا کر ملتی ہے اور سندھ کی سرزمین کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے جس کا مشرقی حصہ ہندوستان کی سرزمین کو جاتا ہے اور مغربی حصہ مکران کی سرزمین تک پہنچتا ہے۔ مہران ندی کا اصل سرچشمہ جیحون سے نکلتا ہے اور وہاں سے ملتان کو پہنچتا ہے اور پھر بسمد اور اس کے بعد رور (روڑ) اور پھر منصورہ تک پہنچتا ہے۔[54] پھر یہاں سے کئی شاخوں میں ہوتا ہوا بحر ہند میں جاملتا ہے۔[55] مسعودی نے سندھ ندی کے بارے میں دقیق اطلاعات فراہم کی ہیں اور اس نے مہران ندی کو بیان کرنے سے پہلے پنجاب کی توضیح بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ تمام ندیاں ملتان سے گذرتی ہیں اور تین روز کے فاصلہ پر جا کر ملتان اور منصورہ کے بیچ ایک محلّہ ہے جسے ''دوسات'' کہتے ہیں وہاں جا کر مل جاتی ہیں اور جب یہ تمام ندیاں رور (روڑ) شہر کے مغربی حصہ میں جا کر ایک جگہ ملتی ہیں تو اس کو مہران کے نام سے جانا جاتا ہے اور یہاں سے دو حصوں میں تقسیم ہو جاتیں ہیں اور (دونوں کو مہران ندی کے نام سے پکارا جاتا ہے) پھر بحر ہند میں جا ملتی ہیں۔[56] جب یہ ندی منصورہ کو پہنچتی ہے تو ایک نہر کی صورت میں منصورہ کو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔[57] خلیج فارس کے بعد ہندوستان اور سندھ کی طرف جو بندرگاہیں پائی جاتی ہیں ان میں بلوچستان میں واقع تیز نامی علاقہ پایا جاتا ہے، کہ جس کے ساتھ ساتھ دیبل اور اس کے بعد کنبایہ (جس کو آج کھنبات کے نام سے جانا جاتا ہے) اور پھر سوبارہ اور صیمور جیسے علاقے بھی موجود تھے۔[58] ان تمام دریائی راستوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے ذیل میں ایک نقشہ کھینچا ہے تاکہ شہر منصورہ سے مربوط اس وقت کے دریائی راستوں کو بہتر طریقہ سے درک کر سکیں۔

البتہ مرور ایام کے ساتھ ساتھ ان تمام برّی اور بحری راستوں میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہی ہیں اسی لئے ہم نے ان تبدیلیوں کے مد نظر ان نقشوں کو پیش کیا ہے جن کو جناب ابو ظفر ندوی نے اپنی کتاب میں ادوار کی تبدیلیوں کے پیش نظر کھینچا ہے۔

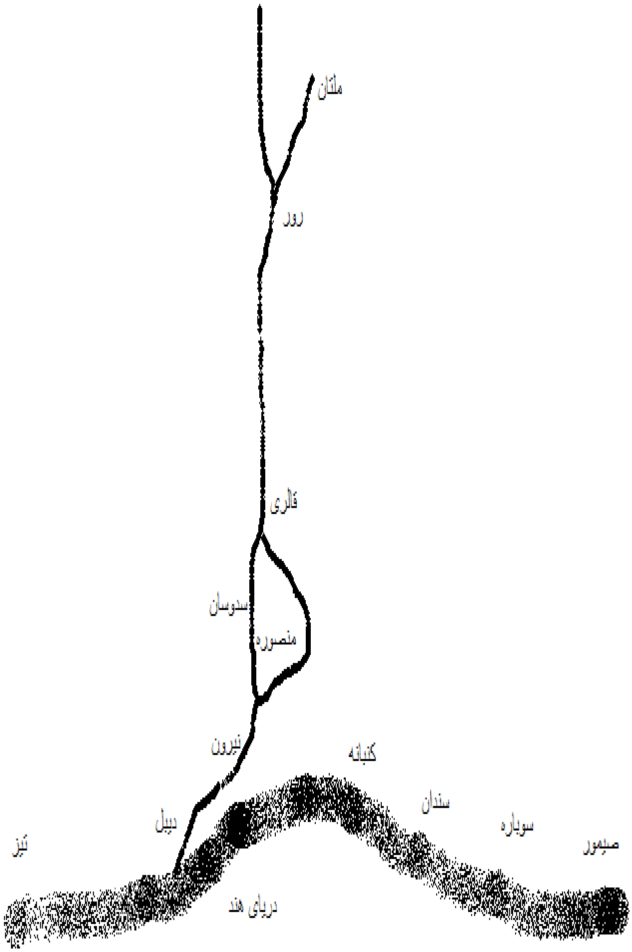
ملتان
رور
قالری
سدوسان
منصوره
نیرون
کنبایه
سندان
دیبل
سوباره
تیز
صیمور
دریای هند

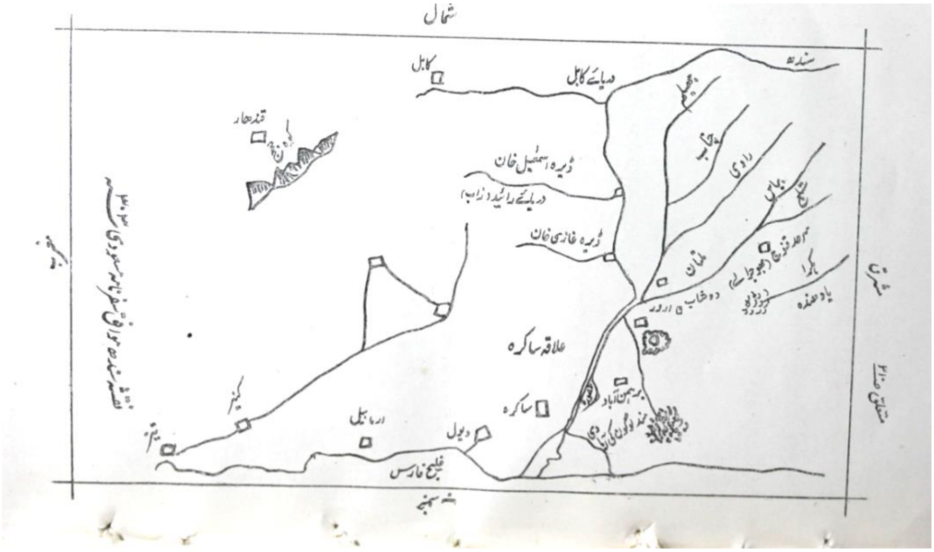


مذکورہ بالا نقشہ سنہ ۳۰۳ھ میں مسعودی کی اطلاعات کے پیش نظر تہیہ کیا گیا ہے جس میں برّی اور بحری راستوں کو بھی معین کیا گیا ہے۔[59]

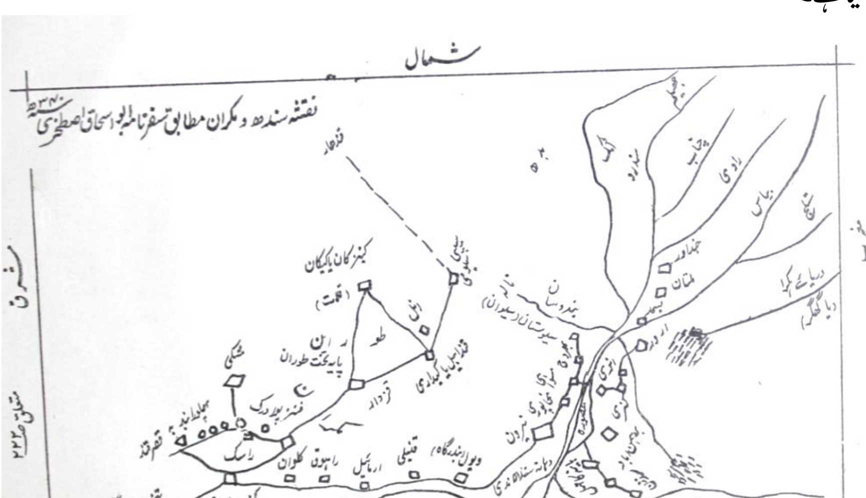


مذکورہ بالا نقشہ اصطخری کی اطلاعات کے مطابق کھینچا گیا ہے۔

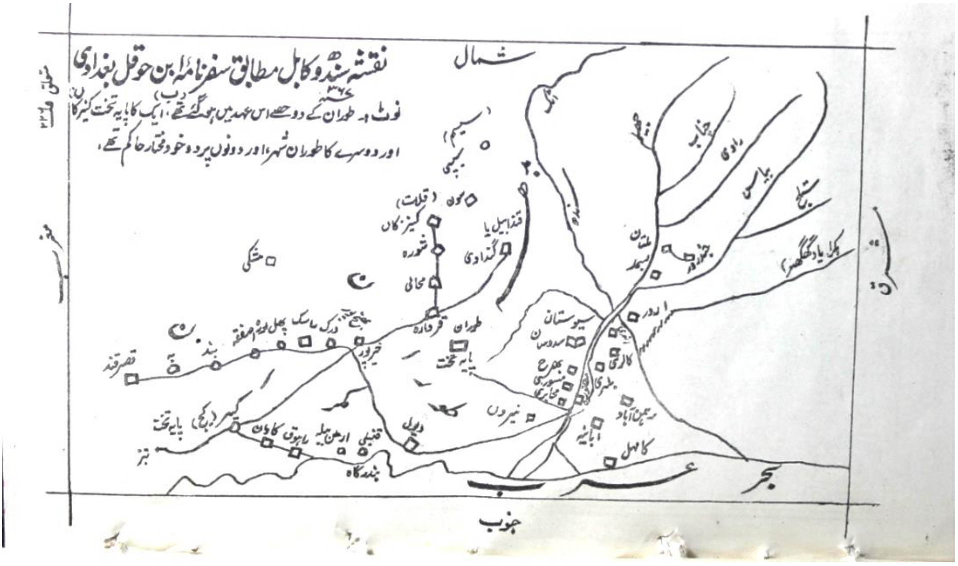


مذکورہ بالا نقشہ ابن حوقل کی اطلاعات کے مد نظر کھینچا گیا ہے۔

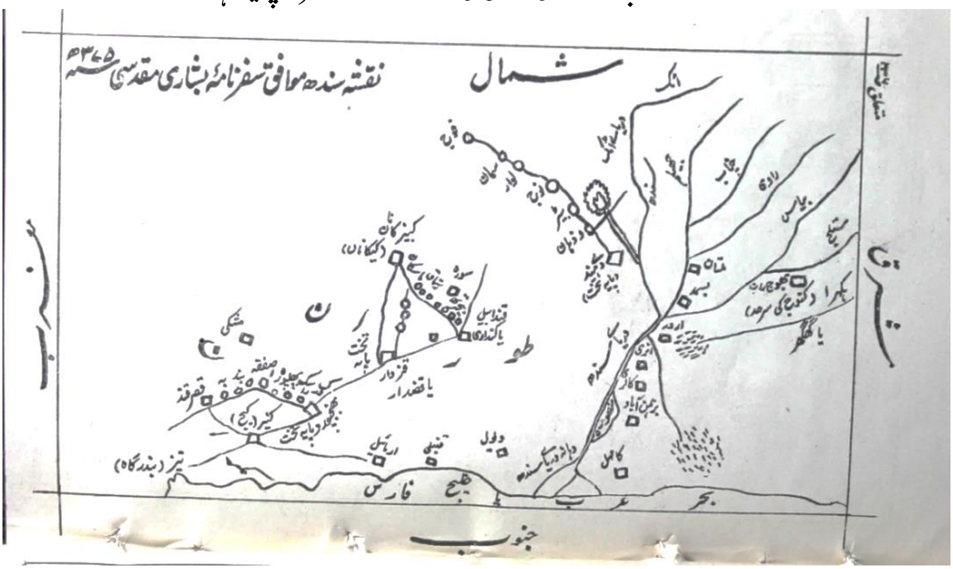


مذکورہ بالا نقشہ کو مقدسی کی سنہ ۳۷۵ھ کی اطلاعات کے مطابق تہیہ کیا گیا ہے۔

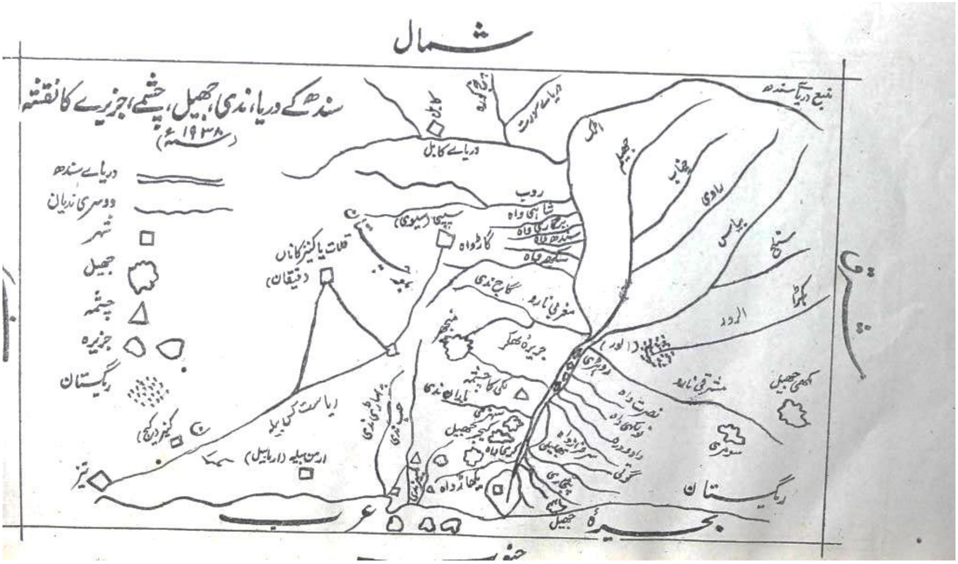


یہ سندھ کا جدید نقشہ ہے جو سنہ ۱۹۳۸ء میں کھینچا گیا ہے۔[60]

ان تمام نقشوں کے مطالعہ کے بعد ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ منصورہ شہر ایسی جگہ پر واقع تھا جہاں سے ہر طرف راستے جاتے تھے اور یہ شہر ایک ایسے مرکز پر واقع تھا جو تمام علاقوں کو آپس میں جوڑنے کا کام کرتا تھا اور اس شہر کو ابتدائی صدی ہجری میں سندھ و ہند کے مختلف علاقوں میں اسلامی تہذیب و ثقافت کو عام کرنے ایک اہم سر چشمہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے جہاں سے تمام طرح کے مسافروں کا گذر ہوتا تھا۔

## منصورہ کی سیاسی تاریخ کا مختصر جائزہ

### ا۔ حکومت بنی امیہ کا دور

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ حکم ابن عوانہ کلبی کی گورنری کے زمانے میں یہ شہر عمرو ابن محمد ابن قاسم کے ہاتھوں بنایا گیا۔[61] اسی لئے ان سے قبل کے حاکموں کے سیاسی حالات کو ہم قلمبند کرنے سے گریز کرتے ہیں البتہ اس شہر کے قیام کے بعد جنہوں نے یہاں پر حکومت کی ہے ان میں منصور بن جمہور کلبی (سندھ میں بنی امیہ حکومت کی طرف سے بھیجا جانے والا آخری حکمران) ہے جس کو ولید ابن یزید (۱۲۶ تا ۱۲۵ھ) نے سنہ ۱۲۶ھ میں منصورہ کا والی بنا کر بھیجا تھا۔ وہ بنی امیہ کے زوال کے دو سال بعد تک عباسی حکومت کا مقابلہ کرنے میں کامیاب رہا اور منصورہ پر حکومت کرتا رہا[62] لیکن دو سال کے بعد یہ شہر عباسی حکومت کے ہاتھوں میں آگیا۔

### ۲۔ حکومت بنی عباس کا دور

بلاذری کی روایت کے مطابق ابو مسلم خراسانی نے مغلس عبدی کو اپنا پہلا والی بنا کر سندھ کی جانب بھیجا تھا جس کا منصور بن جمہور نے ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہوئے اسے قتل کر دیا تھا جس کی وجہ سے اس کا لشکر بھی بھاگ گیا۔ جب یہ خبر ابو مسلم کو ملی تو اس نے فورا موسی ابن کعب تمیمی کو سندھ کی طرف روانہ کیا اور موسی نے منصور کو شکست دے کر سندھ کے تمام علاقوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور پھر اس نے شہر منصورہ کی تجدید کرتے ہوئے وہاں کی مسجد کو وسعت دی اور ساتھ ہی ساتھ کئی نئے شہروں کو ہندوں کے تسلط سے آزاد کرکے ان پر بھی قبضہ کر لیا۔[63] جب وہ سندھ کی سرزمین سے واپس جانے لگا تو اس نے اپنے بیٹے عیینہ ابن موسی کو اپنا جانشین مقرر کر دیا لیکن اس کی جانشینی پر لوگوں میں اختلاف تھا جس کی وجہ سے ابو جعفر منصور نے عمر ابن حفص کو سندھ کے لئے روانہ کر دیا لیکن جب وہ منصورہ پہنچا تو عیینہ نے اپنا منصب چھوڑنے سے انکار کرتے ہوئے اس کا مقابلہ کیا اور جب جنگ شروع ہو گئی تو عیینہ کے ساتھیوں نے صلح کرنے کی پیشکش کر دی جس کو عمر ابن حفص نے قبول کر لیا جس کے نتیجہ میں عیینہ کو منصور کے پاس بھیج دیا گیا۔ عمر ابن حفص نے دو سال تک منصورہ پر حکومت کی۔ دو سال کے بعد منصور نے اس کو معزول کرکے ہشام ابن عمر کو سندھ کی حکومت سپرد کر دی۔ اس نے سندھ و ہند کے مختلف علاقوں میں لشکر کشی کی اور پھر اس نے منصورہ میں اپنے بھائی بسطام ابن عمرو کو اپنا جانشین بنایا اور ملتان کو اپنے قبضہ میں لینے کے لئے نکل گیا۔[64]

اس کے بعد جب ہارون رشید کا زمانہ آیا تو اس نے ایک کے بعد ایک کئی لوگوں کو سندھ کا والی بنا کر بھیجا تھا جن میں سالم یونسی، اسحاق ابن سلیمان ابن علی ہاشمی، طیفور ابن عبداللہ ابن منصور حمیری،[65] عیسی ابن جعفر ابن منصور، عیسی محمد ابن عدی ثغلبی، عبدالرحمٰن اور پھر ایوب ابن جعفر ابن سلیمان اور اس کے بعد سنہ ۱۸۳ ہجری میں داود ابن یزید ابن حاتم مہلبی کو سندھ کے لئے انتخاب کیا لیکن اس نے اپنے چھوٹے بھائی مغیرہ کو بھیج دیا کہ جس سے وہاں پر موجود نزاری قبیلے کے لوگوں نے احتجاج کر دیا اور ان لوگوں نے سندھ کی سرزمین کو چار حصوں میں تقسیم کرنے کا پلان بنایا جس کا ایک حصہ قریش کے ماتحت ہو دوسرا حصہ قبیلہ قیس کے ماتحت تیسرا حصہ قبیلہ ربیعہ کے ماتحت اور چوتھا حصہ یمنیوں کے پاس لیکن یہ کہ بعد میں انہیں وہاں سے باہر کر دیا جائے۔ لہذا جیسے ہی مغیرہ منصورہ شہر کے نزدیک پہنچا تو لوگوں نے منصورہ شہر کے دروازوں کو بند کر دیا لیکن مغیرہ کسی طرح شہر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے نزاری قبیلے والوں سے جنگ کی لیکن وہ اس جنگ میں وہ ہار گیا۔ داود ابن یزید کو جیسے ہی مغیرہ کے شکست کی خبر ملی تو وہ خود سندھ کی طرف روانہ ہوا اور گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں بہت سے نزاری قبیلے کے لوگ مارے گئے اور تقریبا بیس دن تک جنگ کا سلسلہ چلتا رہا پھر اس کے بعد وہ برابر سندھ کے دوسرے علاقوں کو بھی فتح کرتا رہا اور

اس پر تسلط پاتا رہا[66] یہاں تک کہ مامون عباسی کا زمانہ آگیا اور مامون کو یہ خبر دی گئی کہ بشر ابن داود مہلبی سر کشی پر اتر آیا ہے لہٰذا اس نے حاجب ابن صالح کو سندھ کے لئے روانہ کیا وہ جیسے ہی مکران پہنچا تو وہاں پر بشر ابن داود کے ایک بھائی سے ملاقات ہوئی اور دونوں میں جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ کی خبر مامون کو دی گئی کہ بشر نافرمان ہو گیا ہے اور جنگ پر آمادہ ہے اس پر مامون نے غسان ابن عباد کو سندھ کے لئے روانہ کیا اور ساتھ ہی ساتھ موسی ابن یحیٰی ابن خالد برمکی کو بھی بھیجا۔ غسان جیسے ہی سندھ پہنچا تو بُشر نے اس کا استقبال کیا اور بغیر کسی جنگ وجدال کے اس کے فرمان کے ماتحت آگیا لہٰذا اس کو عراق بھیج دیا گیا اور موسی ابن یحیٰی کو سندھ کی حکومت سونپ دی گئی۔ موسی نے وہاں حکومت کو برقرار رکھا اور اس کے بعد اس کے بیٹے عمران ابن موسی نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔[67]

الواثق باللہ کی حکومت کے زمانہ میں سندھ کے حالات ناگفتہ بہ ہو گئے تھے اور عمران ابن موسی کو بھی قتل کر دیا گیا تھا اس لئے الواثق باللہ عباسی نے ایتاخ عنبسہ ابن اسحاق ضبی کو سندھ کے لئے بھیجا جب وہ سندھ پہنچا تو سندھ پر کئی بادشاہوں کا قبضہ ہو چکا تھا لیکن جیسے انہوں نے عنبسہ کے آنے کی خبر سنی تو عثمان کے علاوہ سبھی نے اس کے ماتحت رہنے کا فیصلہ کر لیا اور نو سال تک اس نے سندھ کی سرزمین پر حکومت کی[68] یہاں تک کہ متوکل عباسی کا زمانہ آگیا اور متوکل نے عنبسہ کو معزول کر کے ہارون ابن ابی خالد کو سندھ کی حکومت کے لئے روانہ کر دیا۔[69] لیکن سنہ ۲۴۷ھ میں متوکل کے قتل ہونے کے بعد عمر ابن عبد العزیز نے منصورہ کی حکومت کو موروثی بنا دیا اور اس نے عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا یہاں تک کہ محمود ابن سبکتگین نے ان کی حکومت ختم کر دی اور منصورہ کو اس نے اپنا دار الخلافہ قرار دے دیا۔[70]

عمر ابن عبد العزیز نے اپنے زمانے میں منصورہ کو مرکز قرار دیتے ہوئے اپنے بیٹے عبد اللہ کو سندھ کا حاکم بنا دیا تھا اس نے بھی اپنے والد کی طرح خلیفہ عباسی کے نام کا خطبہ پڑھا تھا۔ عبد اللہ کے بعد اس کا بیٹا ابو المنذر عمر منصورہ کا حاکم قرار پایا جیسا کہ مسعودی نے لکھا ہے کہ جب وہ ''سنہ ۳۰۰ھ کے بعد منصورہ گیا تو وہاں پر ابو المنذر عمر ابن عبد اللہ کی حکومت تھی کہ جس اس کے وزیر کا نام رباح تھا، مسعودی کے بقول: وہاں پر میں نے اس کے دونوں بیٹے محمد اور علی کو بھی دیکھا اور وہاں کے سردار جو حمزہ نام سے مشہور تھا اس سے ملاقات بھی کی۔ وہاں پر عمر ابن علی اور محمد ابن علی کی نسل سے فرزندان ابوطالب کی اچھی خاصی تعداد تھی اور اس شہر میں زمانے تک بادشاہی نظام تھا ہبار ابن اسود کے فرزندوں کی حکومت تھی جو بنی عمر ابن عبد العزیز قرشی کے نام سے مشہور تھے''۔[71]

مقدسی نے بھی سنہ ۳۷۵ھ میں منصورہ کا سفر کیا تھا جس کے بارے میں اس نے لکھا ہے کہ ''منصورہ میں قریش قبیلہ کا ایک سلطان تھا جو عباسی خلفا کے نام کا خطبہ پڑھتا تھا''۔[72] سنہ ۳۷۵ھ کے بعد سے منصورہ کے بارے کوئی قابل توجہ اطلاعات تاریخی کتابوں میں نہیں ملتی مگر ابن خلدون نے ایک روایت بیان کی ہے کہ خاندان عمر ابن

عبدالعزیز کی اس موروثی حکومت کو محمود ابن سبکتگین نے ختم کر دیا تھا۔[73] اگرچہ بعد کے ادوار میں عباسی خلفاء کی سیاست سندھ میں کمزور ہو گئی تھی لیکن پھر بھی مذہبی نقطہ نظر سے لوگ عباسیوں ہی کے نظریئے کے موافق وہاں زندگی بسر کرتے تھے اور انہیں کے نام کا خطبہ بھی پڑھا جاتا تھا۔[74] چوتھی صدی ہجری کے بعد اور سندھ میں غزنویوں کی حکومت، اس کے بعد غوریوں کی حکومت اور بالخصوص بابریوں کی حکومت نے ہندوستان و سندھ کی سیاسی تاریخ میں ایک نیا باب کھول دیا اور غزنویوں کے ظہور اور ان کی دہلی تک رسائی سبب بنی کہ منصورہ شہر کی سیاسی کارکردگی کو معطل ہو جائے اور رفتہ رفتہ تاریخ کے اوراق میں یہ شہر گم ہو جائے۔ لیکن اس بارے میں ہم کوئی اطلاع نہیں ملتی کہ منصورہ کی سیاسی مرکزیت کا خاتمہ کب ہوا؟ البتہ پانچویں اور ساتویں صدی ہجری کی کچھ اطلاعات ملتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی منصورہ کا وجود تھا جیساکہ ابن اثیر نے محمود غزنوی کے ہندوستان سے پلٹنے سے متعلق جو روایت تحریر کی ہے اس میں لکھا ہے کہ ''جب محمود غزنوی سومنات سے فارغ ہو کر واپس لوٹ رہا تھا تو اس نے منصورہ جانے کا فیصلہ کیا کیونکہ وہاں کا حاکم مرتد ہو گیا تھا اور جیسے ہی وہاں کے حاکم نے محمود غزنوی کے آنے کی خبر سنی تو وہاں سے بھاگ کر جنگل میں پناہ گزین ہو گیا۔ محمود غزنوی نے وہاں کے لوگوں کا احاطہ کرکے اکثر لوگوں کو قتل کے گھاٹ اتار دیا اور بہت کم ایسے لوگ تھے جو اپنی جان بچاسکے''۔[75] اسی طرح منہاج الدین سراج نے سنہ ۶۴۳ھ کے متعلق ایک روایت نقل کی ہے کہ ''جب منکوتہ مغولی نے اپنے لشکر کے ساتھ سندھ پر چڑھائی کی تو اس نے اوچھ (Uchcha) کے مشہور قلعہ اور سرزمین منصورہ کا محاصرہ کر لیا تھا''۔[76]

## نتیجہ

مذکورہ بالا تمام اطلاعات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ شہر منصورہ سندھ میں اسلامی تہذیب و ثقافت کا اولین نمونہ تھا جہاں سے اسلام نے ہندوستان اور سندھ کے مختلف علاقوں میں وسعت پائی اور یہ شہر دوسری صدی ہجری میں اپنے قیام سے لے کر ساتویں صدی ہجری تک اپنے اسی نام ''منصورہ'' کے ساتھ باقی تھا اور باقاعدہ طور پر وہاں کے لئے حاکم معین کئے جاتے تھے لیکن ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں اس شہر کا نام نہیں لیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس زمانہ تک شہر منصورہ کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا تھا۔ البتہ ابھی تک ہمیں یہ اطلاعات فراہم نہیں ہو سکیں کہ ایسے عالیشان شہر کا زوال کیسے ہوا اور یہ مسئلہ ابھی تک مورخوں کے درمیان زیر بحث ہے۔ آخر میں ایک مختصر نتیجہ گیری کے طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دوسری صدی ہجری میں شہر منصورہ کا قیام عمل میں آیا جو مسلسل اسلامی حاکموں کی سکونت گاگاہ اور مرکز قرار پاتا رہا اور اس شہر کی دوسری خاصیت یہ تھی کہ یہ ایسی جگہ پر واقع تھا کہ سندھ کے تمام علاقوں کو برّی اور بحری راستوں سے جوڑے ہوئے تھا

اور محمود غزنوی و سلاطین ہند کے آنے سے قبل تک شہر منصورہ سیاسی اور مذہبی لحاظ سے اہمیت کا حامل تھا جہاں پر عباسی خلفاء نے حکمرانی کی اور پھر محمود غزنوی نے بھی اسے اپنا دارالخلافہ قرار دیا تھا لیکن اسلامی حکومت کی دہلی و ہندوستان و سندھ کے دیگر علاقوں تک رسائی سبب بنی کہ شہر منصورہ اپنی مرکزیت کھو بیٹھے اور ساتویں صدی ہجری کے بعد گمنامی کا شکار ہو جائے۔

*****

## حوالہ جات

1۔ بلاذری، ص613؛ ابن اثیر، 142:13؛ ابن خلدون، 103:2

2۔ مجہول المولف، ص118

3۔ بیرونی، القانون المسعودی، 75:1؛ بیرونی، التحقیق ماللہند، ص121

4۔ بلاذری، ص620-619؛ ابن اثیر، 197/13؛ حسنی، 24/1

5۔ بلاذری، ص620-619؛ یعقوبی، تاریخ یعقوبی، 296:2؛ ابن اثیر، 197:13؛ حسنی، 24:1۔ مسعودی کے مطابق منصور بن جمہور کی وجہ سے منصورہ نام قرار دیا گیا تھا۔ (رجوع کریں: مسعودی، 166:1) البتہ منصورہ سے متعلق تمام اطلاعات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ گویا محفوظہ نام کا شہر ہند کی سرزمین پر تعمیر ہونے والا پہلا شہر تھا اور منصورہ کو دوسرا شہر قرار دیا جاسکتا ہے

6۔om gupta, 9:1483

7۔ بلاذری، ص620-619؛ یعقوبی، تاریخ یعقوبی، 296:2؛ ابن اثیر، 197:13؛ حسنی، 24:1

8۔ om gupta, 9:1483

9۔ اصطخری، قلمی نسخہ، ص106؛ ابن حوقل، قلمی نسخہ، ص179

10۔ ابن خردازبہ، ص65

11۔ مقدسی، 702:2

12۔ مسعودی، 1:165-166

13۔ اصطخری، قلمی نسخہ، ص175، ابن حوقل، صورہ الارض، 323:2

14۔ دیبل آج کے ٹھٹھہ مقام پر واقع تھا جو کراچی کے نزدیک واقع ہے۔ (رجوع کریں: ندوی، سید سلیمان، ہند و عرب کے تعلقات، ص302)

15۔ نیرون نامی علاقہ آج کے پاکستان کے حیدرآباد میں واقع تھا۔ (رجوع کریں: ندوی، سید سلیمان، ہند و عرب کے تعلقات، ص400

16۔ قالری، انری، بلری، مسواہی و فہرج یا بہرج یہ سب علاقے منصورہ سے ملتان جانے کے راستے پر واقع تھے جن کا قدیمی نام اب باقی نہیں رہا

17۔ سندان نامی علاقہ آج کے کچھ «cutch» علاقہ میں واقع تھا جو موجودہ گجرات ہندوستان میں واقع ہے

18۔ کنبانہ، سوبارہ وصیمور نامی علاقے موجودہ گجرات ہندوستان کے علاقے میں سمندر کے کنارے واقع تھے (رجوع کریں: ہند و عرب کی تعلقات، ص55)

19۔Y. Friedmann.6:439-440

20۔om gupta, 9:1483

21۔ عزیزاللہ عطاردی ایک ایرانی عالم دین ہیں جنہوں نے ہندوستان اور پاکستان کا سفر کیا ہے اور وہاں کے کتب خانوں میں موجود قلمی نسخوں پر کام کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ایک سفر نامہ بھی لکھا ہے جس میں ہندوستان اور پاکستان میں موجود علمی ذکیرہ کا تذکرہ کیا ہے

22۔ عطاردی، ص380

23۔ حموی، 211:5

24۔ مقدسی، 704-705:2

25۔ایضا، 704:2

26۔ایضا، 704-705:2

27۔اصطخری نے لکھا ہے کہ سیب کی مانند ایک پھل پایا جاتا تھا جسے لوگ اللیمونہ کہتے تھے۔(رجوع کریں: اصطخری، المسالک و الممالک، ص 173).

28۔ ہو سکتا ہے یہ قندھاریات ہو جیسا کہ ابن حوقل نے قندھاریات ہی استعمال کیا ہے (رجوع کریں: ابن حوقل، صورۃالارض، 321:2)

29۔ حموی، 211/5؛ اصطخری، المسالک والممالک، ص173

30۔ ایضاً؛ ابن حوقل، صورۃالارض، 321:2

31۔ مقدسی، 707:2

32۔ مسعودی، 501:1

33۔ مقدسی، 704-705:2

34۔ حموی، 211:5؛ اصطخری، المسالک والممالک، ص173؛ ابن حوقل، صورۃالارض، 320:2

35۔ابن حوقل، صورۃالارض، 325:2

36۔اصطخری، المسالک والممالک، ص173؛ ابن حوقل، صورۃالارض، 321:2

37۔ ابن خردازبہ، ص65.

38۔ مقدسی، 704-705:2

39۔ قوم مید، ایسی قوم تھی جو قدیم زمانے سے سندھ ندی کے کنارے پر زندگی بسر کرتی تھی اور یہ لوگ وحشی و غارتگر ہوتے تھے جو ہمیشہ جاٹوں کے ساتھ جنگ وجدال کیا کرتے تھے۔ (رجوع کریں: شرر، 19:1)

40۔ مسعودی، 166-165:1

41۔ مقدسی، 715:2؛ ابن حوقل، صورۃالارض، 326:2، اصطخری، المسالک والممالک، ص179

42۔ ایضاً؛ ابن حوقل، صورۃالارض، 327:2

43۔ابن حوقل، صورۃالارض، 2:327-326؛ مقدسی، 2:715؛ حموی، 5:211

44۔ مقدسی، 2:715

45۔ایضاً

46۔ایضاً

47۔رامہرمزی، 1:82

48۔ ابن حوقل، صورۃالارض، 2:327؛مقدسی، 2:715

49۔ مسعودی،1:165-166

50۔ مقدسی، 2:715

51 ۔۔ایضاً

52۔یعقوبی، البلدان، ص22

53۔ابن خردازبہ، ص42

54۔اصطخری، قلمی نسخہ، ص106؛ابن حوقل، قلمی نسخہ، ص182، مقدسی، 2:710-709؛ مسعودی،1:165-94

55۔ ابن خردازبہ، ص161

56۔ مسعودی،1:165-164

57۔اصطخری، قلمی نسخہ، ص102، صورہ الارض،ابن حوقل، قلمی نسخہ، ص179، مقدسی، 2:705-704؛ادریسی،1:165

58۔ندوی، سید سلیمان، ہند و عرب کے تعلقات، ص55

59۔ندوی،ابو ظفر، تاریخ سند، ص10

60۔ یہ تمام نقشے ابو ظفر ندوی کی کتاب تاریخ سند میں موجود ہیں جس کو مولف نے بڑی دقت کے ساتھ پیش کیا ہے

61۔ بلاذری، ص620-619؛ یعقوبی، تاریخ یعقوبی،2:296؛ ابن اثیر،13:197؛ حسنی،1:24

62۔ یعقوبی، تاریخ یعقوبی،2:316؛ابن اثیر،10:15؛ خلیفہ ابن خیاط، ص241

63۔ بلاذری، ص621؛،ابن خیاط، ص271

64۔یعقوبی، تاریخ یعقوبی،2:364-363

65۔ایضاً،2:314

66۔ایضاً،2:414

67۔ایضاً،2:487

68۔ایضاً،2:504

69۔ایضاً،2:515

70۔ ابن خلدون، 1:374

71۔ مسعودی،1:165

72۔ مقدسی، مقدسی، 713:2

73۔ ابن خلدون، 374:1

74۔ندوی، سید سلیمان، خلافت اور ہندوستان، ص5

75۔ابن اثیر، 61:22

76۔جوزجانی، 54:2

# کتابیات


1. ابن اثیر، الکامل، ترجمۂ ابوالقاسم حالت و عباس خلیلی، نشر موسسہ مطبوعات علمی، تہران 1371ش
2. ابن خلدون، تاریخ ابن خلدون، ترجمۂ آیتی، عبدالمحمد، نشر موسسہ مطالعات و تحقیقات، 1363ش
3. ابن خردازبہ، ابوالقاسم عبیداللہ بن عبداللہ، المسالک والممالک، انتشارات دار صادر، بیروت، بے تاریخ
4. ابن حوقل، ابوالقاسم محمد، صورہ الارض، نشر دار صادر، افسیت لیدن، بیروت 1938ء
5. ... ، صورۃالارض، قلمی نسخہ مصری
6. ادریسی، ابوعبداللہ محمد بن محمد عبداللہ، نزہہ المشتاق فی اختراق الآفاق، نشر عالم الکتب، بیروت 1409ھ
7. اسماعیل بن علی ابوالفداء، تقویم البلدان، نشر مکتبہ الثقافہ الدینیہ، قاہرہ
8. اصطخری، ابواسحاق ابراہیم بن محمد، المسالک الممالک، نشر الہیہ العامہ لتصور الثقافہ، قاہرہ
9. ۔۔۔، المسالک الممالک، نشر دار صادر، لیدن افسیت، بیروت، 2004ء
10. ۔۔۔، المسالک والممالک، اصطخری، قلمی نسخہ، کتابخانہ مجلس شورای اسلامی
11. بلاذری، ابوالحسن احمد بن یحیٰی، فتوح البلدان، ترجمۂ محمد توکل، نشر نقرہ، تہران 1337ش
12. بیرونی، ابوریحان محمد بن احمد، القانون المسعودی، مصحح عبدالکریم سامی جندی، نشر دار الکتب العلمیہ، بیروت
13. ۔۔۔، تحقیق ماللہند، نشر عالم الکتب، بیروت 1403ھ
14. جوزجانی، منہاج الدین سراج، طبقات ناصری، نشر دنیای کتاب، تہران 1363ش
15. حسنی، شرف عبدالحہ، نزہہ الخواطر وبہجہ المسامع والنواظر، نشر مطبعہ دائرہ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد دکن
16. حموی، یاقوت، معجم البلدان، ترجمۂ نشر سازمان میراث فرہنگی کشور، 1383ش
17. ۔۔۔، معجم البلدان، نشر دار صادر، بیروت 1995ء

18. خلیفہ ابن خیاط، ابو عمرو، تاریخ خلیفہ ابن خیاط، تحقیق، نجیب فواز، نشر دار الکتب العلمیہ، بیروت 1415ھ/1995ء

19. دمشقی، شمس الدین محمد بن ابیطالب، نخبہ الدہر فی عجائب البر والبحر، انتشارات اساطیر، تہران 1382ش

20. رامہرمزی، بزرگ بن شہریار، عجائب ہند، ترجمہ ملک زادہ، محمد، نشر بنیاد فرہنگ ایران، تہران، 1348ش

21. سہراب، عجائب الاقالیم السبعہ الی نہایہ العمارہ، نشر پژوہشکدہ فرہنگ و ہنر اسلامی، تہران

22. شرر، عبدالحلیم، تاریخ سند، نشر دلگداز پریس لکھنو 1907ء

23. عطاردی، عزیزاللہ، سیری در کتابخانہ ہای ہند و پاکستان، ص380، انتشارات عطارد، چاپ اول، 1388ش

24. مجہول المولف، مجمل التواریخ والقصص، تحقیق بہار، محمد تقی، نشر کلالہ خاور، تہران

25. مسعودی، ابوالحسن علی بن حسین، مروج الذہب، ترجمۂ پاینده، ابوالقاسم، انتشارات علمی و فرہنگی، 1374ش

26. مقدسی، ابوعبداللہ محمد بن احمد، احسن التقاسیم فی معرفہ الاقالیم، ترجمہ منزوی، علینقی، نشر شرکت مولفان و مترجمان، تہران 1361ش

27. ندوی، سید ابوظفر، تاریخ سند، نشر مطبع معارف، اعظم گڑھ، ہند 1366ھ

28. ندوی، سید سلیمان، خلافت اور ہندوستان، نشر مطبع معارف، اعظم گڑھ ہند، 1350ھ

29. ---، ہند و عرب کے تعلقات، ناشر ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد یوپی ہند 1930ء

30. یعقوبی، احمد بن ابی یعقوب، البلدان، ترجمۂ آیتی، محمد ابراہیم، نشر بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب، تہران 1347ش

31. ---، البلدان، نشر دار الکتب العلمیہ، بیروت 1422ھ

32. ---، تاریخ یعقوبی، ترجمۂ آیتی، محمد ابراہیم، انتشارات علمی و فرہنگی، تہران، 1371ش

33. Gupta, Om, Encyclopaedia of India, Pakistan and Bangladesh, Published by; Isha Books D43, Prithviraj Road, Adarsh Nagar, Delhi, undeated

34. Y. Friedmann, AL-Mansura, Encyclopedia of Islam2, undeated

# Early Childhood Development
## (A Review of Integral Components)

**Mohib Raza**


## Abstract

*A child is born with all the potentials and capabilities that are required for acquiring basic human qualities. Early childhood is a very delicate period of developing and supporting this crude state of the child, which in turn supports building of his self-esteem and confidence in his abilities. This early development of the toddler can be reinforced by providing apt environs for his free movement and associations, having his/her own experiences, developing, nurturing and fostering each dimension of his/her personality, and transferring all his individual potentials to the fullest. A free environment and mindset to act, perform and play with a sense of autonomy, is in harmony with this initial state of the child, and should be the appropriate setting for the early childhood development paradigm. The primary setting for this holistic development and progression of potentials towards perfection needs the establishment of a specific theoretical background, identification of themes and discussion of various aspects to be carried out at first. For this vital and important stage of early childhood development, five inclinations of fit'rat are discussed, as endowed by the Allah Almighty. These inclinations lay the foundations for any further development of child's behaviors and personality, and are the required integral virtues in the upcoming stages of his life.*


**Key Words:** *Early Childhood, Development, Integral Components, Sovereignty, Freedom, Play, Fit'rat.*

## *Introduction:*

*All individuals move towards independence from the dependence of infancy and childhood, and as teachers, mentors and parents it is our responsibility to guide them in this quest to become a zestful, happy and content adult Nirmala Rao, 2019. Human child as a developing individual is a subject of scientific inquiry that requires a systematic formulation; this directs us to the problem of child development and its understanding and comprehension". A child is a whole which is articulated with many parts, in which physical, socio-emotional and cognitive domains are some of the fundamental elements (Zaff, 2003). Human development is not related to the individuals only but also includes the environment the individual finds himself in. This includes fulfilling individual's nutritive and experiential requirements, addressing societal responsibilities and expectancies, and providing direction for the development of behaviors for his expression and interaction (Bell, 1940).*

*Does the child has his own individuality or it is developed and designed by the people around him? This is an important question to answer that whether a child is like a dough, to be formed and reformed, or does he himself has to discover his potentials and develop within self (Suissa, 2006). Generally, it is believed that children show less attraction towards responsibility and 'the ought', and hence, whichever action brings him relief and comfort is performed freely by him (Charlotte R. Vallinga, 1987).*

*Educational institutes, such as schools, have been established over a period of time to support and develop the personality and capabilities of the learners. Here, an important inquiry to be pursued is to identify whether these institutes are fulfilling the purpose they were made for? The importance of pupil's individuality and development of his identity in an atmosphere of freedom is the essential spirit of this first phase of education. The institute of the school was established for the purpose of serving the society, but it should not merely make the individual subservient to the society.*

*Pupil personality is sacred and every stakeholder should value this fact. The personality of the pupil should not be sacrificed on the altar of standardization; the purpose of the education is to set the soul of child free in the pursuit of truth and this cannot be done without appropriate amount of freedom (Broudy 2017).*

*Thus, the major ingredients of an active educational institute are freedom and child centered quality, in which objectives are thoroughly planned and tested to attain the maximum efficiency in using the interest and time of the child (Lerkkanen, 2016). The preschool is an institution that develops the totality in the personality of the children. A wide variety of required spheres of life are systematically supervised, routines are controlled and abilities are developed there (Horowits, 1940).*

*Another key aspect in the development of the child is the family, which being the microcosm of the society (Hess, 2018), has the fundamental responsibility of child nourishment and upbringing that cannot be performed by the school or any other institute. School can supplement the task of parents but it may not and should not ask to perform, what should be done by the parents (Belsky, 1984)*

*Much has been said and theorized in the domain of early childhood education and development. It is a fact that the most indispensable, crucial and decisive period in the growth and development of a human being is that of his early childhood. This period provides the foundation for the further progress and excellence of his personality, character, traits, behaviors, learning style and patterns (Papalia, 2007). Plenty of consideration and attention is required to identify, evaluate, analyze and develop the methods, processes and boundaries of this domain of early childhood development.*

*Defining the shape and circumstances of a child's ambiance, understanding his basic traits and adopting appropriate methodology to preserve that to its natural condition is of critical importance for the holistic and natural growth of the child. In this article, a brief review is presented, starting from a couple of basic characteristics of humans and then converging the discussion on to*

*the basic ingredients required for this early child development, which are integral for the formation of a conducive environment and are necessary for the appropriate nurturing of the child.*

### *Human Being, a Distinguished Creation*

*All the existence, present in this material and non-material world, is created by a single Creator and among these creations, a superior kind is present known as human being (Farhadiyan, 1999). How is this being superior, enriched and enhanced from other species that are also blessed with life? What features could there be that differentiate human beings from other creations? They all share the basic traits of life alike; the attribute of movement, feeding, reproduction, growth and feelings. Perceptions and understanding are also common in most of the creations (Bahishti, 2011). Then the question that arises is that what brands them apart?*

*Amongst all these creations, human beings have specific distinct features and qualities. Humans are created with two basic characteristics; firstly, they have the power of analysis and synthesis and secondly, they have the will and freedom of action. It is a state of being that is unique to the humankind only and differentiates human beings from other creations.*

*These two characteristics, that mark this difference, are strictly associated with human beings alone. We are all created with entire permissible authority, power and possibilities to choose from among the right and the wrong, and accomplish willingly with the help of our potentials. These qualities are endowed by the Allah almighty only to the humans to explore, improve, advance and achieve (Bahishti, 2011).*

*Allah almighty has created every other living creature with some self-guiding capabilities and specific characteristics, which are required for their growth and nourishment. They don't need to learn or being taught about any required or necessary responsibilities and tasks for their survival and existence. On the other hand, the blessed combination of wisdom and choice makes an individual sovereign, independent and self-governing, which requires some special*

*arrangement and environment for his development and advancement.*

*These are a couple of the most vital, basic and important traits of human being that start developing, right from his birth and their significance is being felt since old times. These qualities play a major role in developing human learning and nourishment. Development and progression in various aspects of civilization and society is associated with the human skill of being educated, which is also strengthened by the transmission of experiences and understandings of the elders, to their younger generations.*

*This basic characteristic of human being is also addressed as a very first revelation by the Almighty Allah in the Holy Quran, "Who taught by the pen, taught man what he did not know", (The Qur'an 96:5, Translated by A. A. Maududi). This also confers that the subject of this teaching and instruction is solely the human being.*

*Thus, human beings are created with capabilities, competencies and abilities. To expand these potentials of individuals and to make them progress individually and collectively, special conduct as well as an environment is required.*

### *Human Being, a Responsible Creation*

*Allah the Almighty, upon the creation of human beings, declared him as His caliph on this earth. "Just recall the time when your Lord said to the angels, 'I am going to appoint a vicegerent on the Earth'", (The Qur'an 2:30, Translated by A. A. Maududi). It was the will of Allah by this appointment that His distinguished creation would depict every noble characteristic and value that exists, and should make proper use of every blessing bestowed upon it.*

*Secondly, this is also stated in Quran that we are from Him, Allah the Almighty, and we have to return to Him, (The Qur'an 2:156, Translated by A. A. Maududi). So, every action and energy of each human, being an informed individual and having his own will in his actions, should be directed towards Him, the Almighty. Pursuing righteous and moral standards and directing every effort towards the Creator brands the entire human race as a responsible creation.*

*Allah Almighty also declared, that He created man according to His nature (fit'rat), "Adhere to the true nature on which Allah has created human beings", (The Qur'an 30:30, Translated by A. A. Maududi). Thus, He provided the context for the human beings to actualize this commitment of responsibility towards perfection.*

*Hence, by creation, a human possesses all the required capabilities of wisdom, intelligence, insight and goodness; so that he could be able to actualize these potentials, capabilities and competences and could easily carry out this obligation and responsibility with commitment and ease. This holy ideology confers that this righteous being, in this temporary life, strives for a specific objective, in which he completes different levels of perfection and prepares himself for the next eternal life. The desired pure life in this world determines the prime objective of every individual as well as the developmental approach required to attain that objective.*

### ***Human Development, In Stages***

*In viewpoint of human development, majority of the developmental theories consider age a critical factor in the development of a human as they view human growth as advancement from one developmental stage to another. Jean Piaget considers cognitive progression in four different stages from birth to age 12 and further (Siegler, 2016). Bruner considers cognitive representation development in three stages Grider, 1993). According to Erikson's psychosocial development theory, people go through a sequence of eight oldness related stages since their birth to age 65 or more (Thomas, 1996).*

*These initial years as a child, is the most conclusive time in an individual's life, where foundations of his/her personality are laid down. (Cote J. E., 1987). discussed the formation of ego identity of individuals at this very initial stage of lifetime and its relation and effect on the remainder of his/her life cycle as formulated by Erick Erikson (Erikson, 1998).*

*In all of these stages, the leading developmental phase of a child is the most vital i.e. from his birth to 06 or 07 years of age. This period*

*provides the foundation of his profound personality and lifelong learning aptitude. Learning in this age is like an impression on the stone. Every observation and action, hence development of the child, is learning in this age. Jean Piaget explained this process with the terms schemata, assimilation and accommodation (Bodner, 1986). Initially at this stage, a child possesses very little schemata. With a sound and profound development of both, schemata and process of accommodation, cognitive development matures and plays a vibrant role in providing the foundation of a life-long equilibration and learning capability of the child (Piaget, 1952).*

## ***Early Childhood, a Critical Period***

*As mentioned in the last section, childhood is the leading and most vital developmental phase of an individual's life. According to (Elman, 1993). Successful learning depends on starting small, and an individual's greatest learning occurs in this time of childhood. This period shapes the foundation of a child's reflective personality and lifelong achievements. Early attention and care has long lasting consequences on child's development, capability to regulate emotions and the ability to learn (Shore, 1997).*

*In the life span of a human being, these early years are of the greatest importance as individual competencies and personality grooming acquire their roots in this period. Psychologists say that if we compare our abilities as adults to that of a child, it would require us almost 60 years of hard work to achieve what a child can achieve in his first 3 years (Montessori, 1959)..*

*The realm of a child is a pure one and free from any dishonesty and deception. Child sees this world with his unadulterated, unspoiled and clean nature. The sole purpose of early childhood upbringing, and hence education is to keep these traits of a child intact and to prepare him for the future life. Research shows that provision of appropriate consideration in child's care, development and education in this early childhood phase gives the opportunity to evade learning difficulties and personality problems in the future, as well as provides a solid foundation for the success in future education and helps in*

*realizing the meaning of life in the later stages of his life (Phillips, 2000).*

*Thus, for the required, smooth, true and proper development of an individual's learning abilities, cognitive competencies and emotional capabilities the period of early childhood development provides the appropriate opportunity for a perfect beginning.*

*All the basic and elementary developmental areas of a child i.e. sensorial, phonological, physical, intellectual, moral, social etc. are developed rapidly during these early years. Right after the birth, a child starts exploring the environment and learning to communicate, which allows him to construct ideas and concepts about the surrounding world (Meadows, 2012).*

*Child in this era of his development is very inquisitive and curious by nature, and tries to explore everything he observes. He tastes things, throws objects, and imitates elders to experience new things. Preschoolers build and test hypothesis and make inferences, they learn from informal experimentation and from watching and listening to others (Gopnik, 2012).*

*Lev Vygotsky's model of providing scaffold for the child, built its foundation on considering a child as an individual with recognition of his cultural and social background (Jacobs, 2001). Likewise, Piagetian premise of knowledge acquisition is the result of an active process of construction, and preschool learning requires fostering this construction and use of knowledge effectively (Forman, 1977). Autonomous state of a child is thus reinforced through active construction of knowledge. Recognition and preservation of the autonomous state of a child for active learning and building his\her personality's foundation turns out to be the primary assignment in these early years of the individual's life.*

*The inquisitive nature, multidimensional development and process of non-formal learning adheres us to maintain this state of child until some specified time of his age, to ensure holistic growth and prudent lifelong learning behavior. This state or individuality of the child requires considering him as a sovereign individual, arranging enough*

*authority and autonomy to preserve his free movements and inquiring character.*

*To attain this objective, the nature, structure and dimensions of a personality, at this early stage, are needed to be examined, reviewed and understood carefully. Also, as the subject of this learning and instruction is human being, so in order to carry out this complex, delicate and challenging endeavor, basic aspects of the human personality and structure are required to be considered, i.e. the reality and actuality of human being should be recognized, endowed capabilities and competencies should be known, prime objective of the task at hand should be comprehended, and the methodology and resources required for this nurture should be identified beforehand along with any expected challenges.*

*So, an important notion that forms the basis of this arrangement of child development according to the milieu under study is the identification of nature and reality of human being; identification of human potentials; identification of objectives for the individual's development; identification of the resources and means for this endeavor of grooming, mentoring and nurturing and finally the identification of the complications, challenges and difficulties of this task along with their resolution (Amini, 2005).*

## ***Early Childhood Development, What is?***

*As discussed earlier that early childhood is a critical phase in the development of an individual's personality and has effects on a person's overall lifelong achievements. Moreover, this fact is also supported by different contemporary developmental theories that this development occurs in stages and every stage requires its own methodology and approach.*

*A brief overview of the distinguished creation and characteristics of human being is also presented and it was established that sovereign and responsible nature of human beings requires some special developmental criteria and standards. If these benchmarks are not met, one cannot complete his\her life journey perfectly and as per understood requirements.*

*Now, considering the importance of this very first developmental stage and conferring to the saying of Holy Prophet (PUBH), it was stated that, "Child is the ruler during his first seven years, next seven years he is a subordinate and an advisor in the next seven" (Farhadiyan, 2013). Accordingly, here not only the developmental stages of a child have been mentioned but also the developmental states of a child, in various periods, are also discussed.*

*At one other place Holy Prophet (PBUH) expressed, "Let the child play for his first seven years, next seven years guide him and in next seven years take advise from him" (Farhadiyan, 2013). In this earlier stage, phenomenon of play is very crucial and necessary for the development of a child. Play as a training and instruction methodology for the child is very basic and common since a long time.*

*Many contemporary theorists have shed light on this aspect, and various theories of play have been evolved over several centuries (Rubin, 1983). Jean Piaget describes play as pure assimilation (Piaget, 1951), while in Vygotsky's view, play initially demands action and later it becomes imagination (Vygotsky, 1967). Its importance can be recognized through its effect on other related phenomenon such as exploration, peer and social interaction, behavior adjustment and other personality traits (Johnson, 1987).*

*Similarly, in one other statement, Holy Prophet (PBUH) also implied that a child is free during first seven years of his life, (Farhadiyan, 2013). Interaction and association in the first seven years of a child's life turns out to be crucial with respect to his overall personality development and learning foundations. The concept of freedom is also important in parenting practices. As parents and educators raise children to live as humanly as possible, to be themselves and live their own life, they should have a good understanding of the concept of freedom. Freedom involves attaining laws of nature (mind) and rising above conditions (Kotaman, 2013), but staying within the permissible boundaries. Emphasizing this fact (Bahishti, 2011) narrates, "If you don't give food to your child, you are cruel to him, but this is not that*

*big offence. As to, if you confiscate the free living environment from him, you do biggest cruelty with him. Why? Because you have put his humanity in danger."*

*Thus, early phase of early childhood development perceives a child as being a self-governing and sovereign individual with enough autonomy to have ample activities, exploration, observation and play. This thematic concept converges to the subject that sovereignty, freedom and play are one of the basic and integral themes that constitute early childhood development paradigm, scope, boundaries, challenges, methods and techniques which are needed to be researched and documented.*

## *Early Childhood Development, How to?*

*As mentioned earlier, every individual is created upon the fit'rat (Nature) of the Creator. Nurturing the child to the perfection of his\her true potentials means providing him such a sovereign, free and playful environment that keeps this fit'rat (Nature) intact throughout, in this initial phase of his\her life. What basic practices would be required to ensure this holistic nurturing and the availability of suitable environment at this level? What basic attributes of human nature are there, that are needed to be groomed in this environment? To address this question, first attend to these basic concepts of tabi'at (character),* ***ji'bil'lat*** *(Instinct) and fit'rat (Nature) (Muthari, Fitrat, 1990).*

*Generally, the term "**Tabi'at"** is used for non-living things, although sometimes it is used for living things as well, but it is more specific to non-living things. When some characteristics of any non-living thing are needed to be explained, this term is applied. Particular and own attributes of non-living things are in fact their nature (tabi'at). This term is also used for living things in the dimensions which they share with non-living things because living things do possess the characteristics of non-living things but vice versa is not correct.*

*The term "**Ji'bil'lat"** is used mostly for animals, although it is*

*sometimes used a little for humans too, but it is never used for non-living things or plants. Animals do have distinctive qualities and characteristics which guide them throughout their life; these attributes are not attained, but are inherent and instinctive. Moreover, animals are not consciously aware of these instinctive features within themselves. These attributes and characteristics are known as ji'bil'lat*.

"***Fit'rat"*** *is the term used only for human beings and is specific to human character only. This capability is also innate and natural but human being is conscious and aware about this. In addition, this aptitude differs from instinct* (*ji'bil'lat*) *as it relates purely to humans, and is an abstract phenomenon.*

*There are some preferences in human character that are not based on self-centeredness and a general common regard and respect is acknowledged for these inclinations, i.e. the more inclination someone has towards these preferences, the more exalted he will be considered. These noble inclinations are 'tendencies of fit'rat' and in essence they are of five types;*

### *Tendency towards Pursuit of Reality*

*The first one is pursuit of reality. This term implies the quest of wisdom and discovering the universe, meaning that the human has an instinctive inclination to discover and understand the realities as they are. That is, he is eager to realize the existence and creation of 'being' according to its real essence.*

### *Tendency towards Goodness and Virtue*

*One of the inclination that human has, is towards goodness and virtue. This tendency encompasses the moral aspect, which is called ethics. Normally, an individual desires many things which are*

*beneficial and profitable for him, but there are matters where he prefers things not because they are advantageous for him/her but because they are rationally good and valued.*

### *Tendency towards Beauty and Perfection*

*Humans have tendency towards beauty and perfection. This tendency can be in form of liking of exquisiteness or in the form of creating beauty and splendor by their skills, which is termed as 'Art'. Every individual has this preference and nobody is devoid of this intrinsic feeling. Even if a person wears something, he tries to ensure that it looks good on him.*

### *Tendency towards Creativity and invention*

*Another inherent tendency in individuals is to invent things that don't exist. It is correct that human imagines, creates and invents things to fulfil his daily life needs but as knowledge and science are essential for the human life and society, but they themselves are also desirable, likewise creativity and imagination themselves are vital and required.*

### *Love and Submission*

*The fifth inborn capability and tendency in human is to love and submit. Everybody possesses this feeling and it can have many forms. The higher degree of this affection and sentiment places focus on the beloved and leads towards submission. This tendency of love and submission towards perfection is intrinsic. If someone comes across some other more superior and perfect being, he instantaneously diverts his attention to that more superior one.*

*Inferring from above discussion, a child turns out to be a curious, inquisitive and enquiring individual inherently. He tends to be righteous and honest in his endeavors, actions and interactions. His*

*artistic sense, imagination, observation, reflection, ingenuity and creativity are inborn, and his needs for emotional and spiritual aspects of his personality are intuitive. These tendencies and inclinations are essentially needed to be addressed and developed, secured and preserved, established and maintained in this phase of early childhood, so that, being a distinguished creation, every individual can carry out his responsibilities in this material world effectively and efficiently.*

## Conclusion

*Keeping in mind the distinguished and responsible creation of a human being, while being endowed with all the required capacities and capabilities to realize the desired perfection, development is an elective process which itself requires guidance of others and appropriate methods. This process of development and progression is gradual and in phases, in which initial stage of early childhood is the most significant and vital one.*

*Early childhood development contains specific context and perspective where attributes of freedom and independence, which contributes towards the sovereignty of child, are worthy enough to keep them intact and undamaged in the course of child upbringing. Allowed freedom and active participation in activities and play are the basic necessities of this period of child development.*

*Growth of external physical abilities as well as development of internal humanistic inclinations are desired to be addressed in a coordinated and harmonic manner, so that holistic development of a child can be actualized, which in turn will provide the context for his lifelong excellence.*

*Five discussed inclinations are the common elements in humans*

*which are bestowed upon them by the Allah according to His own true nature (fit'rat) in order to direct them towards the common and ultimate goal of perfection and excellence. At this early childhood stage, these five inclinations should be kept intact by the teachers, parents and every other related personnel, as these inclinations integrally constitute and formulate the nature of the child. Difference in their development, realization and direction forms the variance and diversity in human beings, both positively and negatively.*

*A conducive environment, precise methodologies, appropriate activities, consistent and suitable interaction behaviors, maintaining child's individuality and autonomy are essential factors to keep these attributes and inclinations intact. Similarly, avoiding and keeping children away from any potentially harmful and hazardous conditions is also obligatory.*

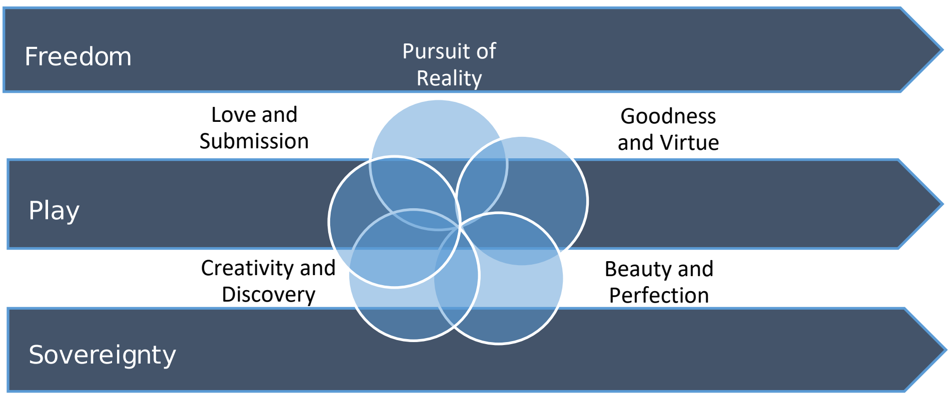


*Fig: Integral Components of Early Childhood Development*

*This discussion concludes to the leading and vital principals of child development i.e. upbringing the free individual (Shukuhi, 1999); Free from other's dominance, free from resentment, wrath, rage and temptations; A sovereign individual with authority and control*

*over his actions and intensions; An active being, giving him appropriate environment to show and demonstrate his/her potentials freely and spontaneously, striding towards perfection (Muthari, 2005). (MutProper development of integral components and inclinations in early childhood with appropriate methods and suitable environment provides the ground for such a transformation of the individuals.*

## Bibliography


1. Amini, E. (2005). Islam and Instruction and Education (5Ed.). Qom: Bustan-e Kitan Publishers.

2. Bahishti, M. H. (2011). Role of Freedom in Child Nurturing. Tehran: Rooznay Tehran.

3. Bell, R. (1940). Notes on Child Development and Education. Journal of Educational Sociology, 14(2), 110-125.

4. Belsky, J. (1984). The determinants of parenting: A process model. Child development, 83-96.

5. Bodner, G. M. (1986). Constructivism: A theory of knowledge. Journal of chemical education, 63(10), 873.

6. Broudy, H. S. (2017). Types of knowledge and purposes of education. In Schooling and the acquisition of knowledge. Routledge, 1-17.

7. Cairns, R. B. (1998). The making of developmental psychology. Handbook of child psychology, 1, 25-105.

8. Charlotte R. Wallinga, A. L. (1987). The development of responsibility in young children: A 25-year view. Early Childhood Research Quarterly 2:2, 119-131.

9. Cote, J. E. (1987). A formulation of Erikson's theory of ego identity formation. Developmental review, 7(4), 273-325.

10. Elman, J. L. (1993). Learning and development in neural networks: The importance of starting small. Cognition, 48(1), 71-99.

11. Erikson, E. H. (1998). The life cycle completed (extended version). WW Norton & Company.

12. Farhadiyan, R. (1999). Instruction and Education in Quran and Hadith (Vol. 1). Qom: Bustan-e Kitab.

13. Farhadiyan, R. (2013). Parents and Responsible Instructors (5 ed. Vol. 622). Qom: Bustan-e-Ketab Press.

14. Forman, G. E. (1977). The child's construction of knowledge: Piaget for teaching children.

15. Gopnik, A. (2012). Scientific thinking in young children: Theoretical advances, empirical research, and policy implications. Science, 337(6102), 1623-1627.

16. Grider, C. (1993). Foundations of Cognitive Theory: A Concise Review.

17. Hess, R. D. (2018). The family as a psychosocial organization. In The psychosocial interior of the family. Routledge, 33-48.

18. Horowitz, E. L. (1940). Child-Adult Relationships in the Preschool Years. The Journal of Social Psychology, 11(1), 41-58.

19. Jacobs, G. M. (2001). Providing the scaffold: A model for early childhood/primary teacher preparation. Early Childhood Education Journal, 29(2), 125-130.

20. Johnson, J. E. (1987). Play and early childhood development. Scott, Foresman & Co.

21. Kotaman, H. (2013). Freedom and Child Rearing: Critic of Parenting Practices from a New Perspective. Social and Behavioral Sciences, 82(0, 39-50.

22. Lerkkanen, M. K.-P. (2016). Child-centered versus teacher-directed teaching practices: Associations with the development of academic skills in the first grade at school. Early Childhood Research Quarterly, 36, 145-156.

23. Meadows, S. (2012). The child as thinker: The development and acquisition of cognition in childhood. Routledge.

24. Montessori, M. (1959). The absorbent mind.

25. Muthari, M. (1990). Fitrat. Qom: Saa'dra Publishers.

26. Muthari, M. (2005). Perfect Being. Qom: Saa'dra Publishers.

27. Nirmala Rao, B. R. (2019). Early childhood education and child development in four countries in East Asia and the Pacific. Early Childhood Research Quarterly, 169-181.

28. Papalia, D. E. (2007). Human development.

29. Phillips, D. A. (2000). From neurons to neighborhoods: The science of early childhood development. National Academies Press.

30. Piaget, J. (1951). Principal factors determining intellectual evolution from childhood to adult life.

31. Piaget, J. (1952). The origins of intelligence in children.

32. Rubin, K. H. (1983). Socialization, personality, and social development. Handbook of child psychology, Vol. 4, 30-34.

33. Shore, R. (1997). Rethinking the brain: New insights into early development.

34. Shukuhi, G. H. (1999). Education and its Phases (22 ed.). Mashad: Astaan Quds Publishers.

35. Siegler, R. (2016). Cognitive development in childhood.

36. Suissa, J. (2006). Anarchism and education : A philosophical perspective. Routledge.

37. Thomas, K. C. (1996). Educational psychology: Windows on teaching. . Madison, WI: Brown and Benchmark.

38. Vygotsky, L. S. (1967). Play and its role in the mental development of the child. Soviet psychology, 5(3), 6-18.

39. Zaff, J. F. (2003). Holistic well-being and the developing child. Well-being: Positive development across the life course.

QUARTERLY SOCIAL & RELIGIOUS RESEARCH JOURNAL

# NOOR-E-MARFAT

Vol. 10 Issue:1 Continues Issue: 43 January to March 2019


**Early Childhood Development**
(A Review of Integral Components)

Comparative Review of Different Opinions of
**Nujûm-ul-Furqân and Tadabbur-i-Qurân**

The Basic Goals & Effects of the
**Creation of Divine Religion by Akbar Shah**

**The Quranic Concept of "Ummat-E-Wahida"**

**The Basic Principles of the Study of the Quran**

**Mansora an Ancient City of Islamic Civilization**
Historical & Political Geography

**Discernment of Nasir Makarim in Tafseer Namoona**
(In Sorah AlNoor)


www.nmt.org.pk

Noor ul Huda Markaz-e-Tehqeeqat (Islamabad)